www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2024

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

جلد:8 شمارہ:7 جولائی 2024

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ New Delhi، NCPUL کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

جہانِ نسواں

آمنہ تحسین کی نقادانہ نظر: ''سماج اور صنفی تصورات'' کے حوالے سے — پروفیسر ثروت خان — 5

ناول: ''کالا پانی'' کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر حبیب النساء بیگم — 8

کہکشاں پروین کا افسانہ ''ٹھنڈی چائے'': ایک تجزیہ — تنویر اختر رومانی — 14

حفیظ میرٹھی کی شعری انفرادیت — ناصرین ثریا — 17

اختر حسین رائے پوری کی تنقید نگاری — عظمت النساء — 21

پو کے مان کی دنیا: ایک سماجی و ثقافتی ناول — تبسم ہاشمی — 26

مضامین فرحت: موضوعات کا قوس قزح — اسنٰی سحر — 29

سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کی نظم 'سروج اسمرتی' ایک جائزہ — شمع عظیم — 35

رشید حسن خاں: حیات اور کارنامے — عظمیٰ رضوان — 39

صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری: ایک جائزہ — ام جوزی — 42

نکہتِ سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 48

افسانہ

ڈیجیٹل بچے — ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ — 49

رشتے — شاہ تاج خان — 51

اندھیرا — عظمیٰ یزدانی — 54

حسنِ سخن

ڈاکٹر گلشن مسرت، ڈاکٹر عافیہ حمید، زیبا خان — 56

صحت

خواتین میں موٹاپا اور اس کے نقصانات — ڈاکٹر اشرف آثاری — 58

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 61

مشعل

خواتین معاشرے کا اہم حصہ ہوتی ہیں۔ صنفی مساوات اور خواتین کی بااختیاری نے عالمی سطح پر مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ خواتین فطری طور پر آزاد ہوتی ہیں ان کو اگر مناسب ماحول فراہم کیا جائے اور ان کو بااختیار بنایا جائے تو وہ معاشرے میں مزید نئے نئے کام سرانجام دے سکتی ہیں۔ معاشی طور پر خواتین کو بااختیار بنانا نہ صرف ان کی ذاتی خود مختاری کو بڑھاتا ہے بلکہ معیشت میں بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ مالی آزادی خواتین کو اپنی زندگی کے فیصلے کرنے اور مستقبل کے بارے میں سوچنے کی آزادی دیتی ہے۔

خواتین کو بااختیار بنانے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان کی تعلیم کو ضروری قرار دیا جائے۔ معاشرے میں ان کو مرد کے برابر ہی ترقی کے مواقع فراہم کیے جانے چاہیے تاکہ وہ خود اپنے اوپر منحصر ہو سکیں۔ ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جائے جو ان کی زندگی میں ترقی کی سمت میں معاون ہو سکے اور وہ بہتر طور پر اپنی نمائندگی کا مظاہرہ کر سکیں۔

معاشی بااختیاری صنفی مساوات کی بنیاد ہے۔ ان کو معاشی طور پر خود مختار بنانا اور ان کی ذاتی خود مختاری کو بڑھانا ان کو معیشت میں بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ معاشی طور پر بااختیار خواتین اپنے خاندانوں کی صحت اور تعلیم میں سرمایہ کاری کرنے کا زیادہ امکان رکھتی ہیں جس سے آنے والے وقت میں بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں بے جا پابندیاں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ دقیانوسی تصورات کو ختم کر کے نئی سوچ اور نئے عزائم ان کے لیے مستقل میں نئی راہیں ہموار کر سکتے ہیں۔

تعلیم اور صحت خواتین کی بااختیاری میں مساوی کردار ادا کرتے ہیں۔ معیاری تعلیم تک رسائی خواتین کو معاشی، سیاسی اور سماجی شعبوں میں مکمل شرکت کے لیے ضروری علم اور مہارت سے آراستہ کرتی ہے۔ شہری علاقوں کی بہ نسبت دیہی علاقوں کی خواتین میں تعلیم کا بہت فقدان ہے۔ خواتین کے حقوق سے متعلق قوانین کے بارے میں نامکمل آگاہی بھی ان کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔

خواتین کو قانونی تحفظات بھی فراہم کیے جانے چاہیے۔ بے جا رویوں کے خلاف ان میں شعور و آگہی کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔ خواتین کی بااختیاری کے لیے ان کو ایک محفوظ ماحول مہیا کرانے کی بھی اشد ضرورت ہے۔

خواتین کی بااختیاری میں رکاوٹ ڈالنے والے چیلنجز وں سے نمٹنے کی اشد ضرورت ہے۔ مختلف میدانوں میں خواتین کی شرکت کو کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ حکومت بھی خواتین کے بارے میں سنجیدہ ہے اور خواتین کی ترقی کے لیے حکومت نے بہت سے اقدامات بھی اٹھائے ہیں۔

خواتین بے پناہ صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہیں ان کے اعتماد اور حوصلے کو تقویت ملے تو وہ مزید بہتر کام کر سکتی ہیں اور مختلف شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔ اپنی کارکردگی سے معاشرے میں دوسری خواتین کا بھی حوصلہ بڑھا سکتی ہیں۔

آپ کا

محمد اقبال

آمنہ تحسین کی نقادانہ نظر

''سماج اور صنفی تصورات'' کے حوالے سے

پروفیسر ثروت خان

اکیسویں صدی کے آتے آتے ادب میں ناقدین کی صف میں کئی نئے نام شامل ہوتے گئے ان میں خواتین نے بھی اپنی موجودگی کو پہلے سے زیادہ پر زور طریقے سے ''خواتین ادب'' کی اصطلاح سے کام کر کے باقاعدہ طور پر درج کروائی ہے۔ جسے ہم ''تانیثی تنقید'' کے بھی لکھ سکتے ہیں۔ اس لیے لکھ سکتے ہیں کہ بات واضح ہو جائے کہ جامعاتی تحقیقی وتنقیدی نظام میں اب بڑے زور وشور سے خواتین نقاد بھی اپنے گہرے تنقیدی شعور کے ساتھ فن پارے کی تشریح وضاحت جیسی روایتی انداز کی تنقید نہیں کر رہی ہیں بلکہ ان کا جمالیاتی ذوق، تحقیقی اور تنقیدی فہم وفکر نے اب اردو تنقید کی دنیا میں مضبوط قدم رکھے ہیں۔ ان کی تحریریں مطالعہ کی سرسری دعوت نہیں دیتیں بلکہ فکری جہتوں کا اہتمام کر کے روایت کے ساتھ ساتھ معاصر علوم کے مطالعے، ارتکاز فکر اور تجزیہ کا علمی وادبی، تحقیقی وتنقیدی ذوق بھی پیدا کرتی ہیں اور خوب کرتی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی پروفیسر آمنہ تحسین ہیں۔

آمنہ تحسین کی فکر کا محور انسانی سماج کی آدھی دنیا ہے۔ یعنی خواتین ان کے مسائل، ان کے درجات، ان کی تعلیم، ان کی اقتصادیات۔ ان تمام فکری مسائل سے آمنہ تحسین اپنی اس آدھی دنیا کو آزاد و دلشاد پرواز کرتے ہوئے دیکھنے کی متمنی ہیں۔ اسی لیے ان کی فکر ''تانیثیت'' کی طرف رخ کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن نہیں، یہاں ذرا ٹھہرنا ہوگا۔ یہ سوچنے کے لیے کہ کیا آمنہ تحسین کی فکر کو ہم تانیثیت تک تو محدود نہیں کر رہے؟ چونکہ آمنہ تحسین، شعبہ تعلیم نسواں، مانو سے وابستہ ہیں اور مضمون ''مطالعاتِ نسواں'' کی تدریس اور تحقیق میں مصروف ہیں لہٰذا انھوں نے بے شک تانیثیت پر لکھا، سوچا، عملی اقدامات بھی اپنے شعبہ کی مناسبت سے اٹھاتی رہتی ہیں، لیکن ان کے قلم کی رو اُن کی فکر کی کئی جہتوں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔

یہ جہتیں کیا اور کس طرح کی ہیں۔۔۔؟ اسے سمجھنا ہوگا۔۔۔۔

اس ضمن میں ''پیش رفت'' (نئی دہلی)، جولائی 2023 کے شمارے میں، پروفیسر ناصر عباس نیّر کا انٹرویو، غضنفر اقبال نے لیا ہے، جس میں نیّر صاحب نے موجودہ تنقیدی فکر کے متعلق بڑی عمدہ بات کہی کہ:

> ''اکیسویں صدی میں تنقید کے سوالات اور کردار بدل گئے ہیں۔ اب تنقید ادب پارے کی محض تشریح ووضاحت نہیں کرتی نیز وہ ادب پارے کا تصور، ایک اپنے آپ میں قائم خود کفیل متن کے طور پر نہیں کرتی۔ اسے ایک وسیع ثقافتی نظام کا حصہ سمجھتی ہے۔ جس میں سیاسی کروٹیں بھی شامل ہیں۔ یعنی وہ ایک طرف ادب سے براہ راست اخذ کی گئی بصیرتوں، دوسری طرف سماجی علوم کی بصیرتوں سے اور تیسری طرف معاصر عہد کے سوالات سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔''

ناصر عباس نیر کے ان افکار پر جیسے ہی نظر جاتی ہے، ذہن میں آمنہ تحسین کی فکری جہتیں کلبلانے لگتی ہیں۔ ایک نقاد کی حیثیت سے ان کی نظر نہ صرف ہندو بین الاقوامی ثقافتی نظام فکر کی بالیدگی کے اردگرد گھومتی ہے بلکہ علمی وادبی بصیرتوں اور سماجی علوم کی جانفشانی معلومات کا بہ حسنِ خوبی احاطہ کرتی ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ''صنفی تصورات'' کی ابتدا کب سے ہوئی۔ کس ادیب ونقاد نے ''صنفی تفریق'' کا اعتراف کیا۔ وہ تاریخ کے تناظر میں تحقیقی نظر سے ہر شعبہ اور ہر پہلو کو دیکھ سمجھ کر دلائل وثبوتوں کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

انگریزی زبان پر عبور رکھنے والی اس نقاد کی تحریروں میں سنجیدہ مطالعے کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی، سائنسی و تکنیکی تبدیلیوں پر ان کے فہم و فراست کے باذوق نقش ابھر کر شعور و آگہی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب ''سماج اور صنفی تصورات (ادب کے آئینے میں) میں شامل ایک مضمون ''تانیثی تنقید: ایک جدید نقطۂ نظر'' میں رقم طراز ہیں:

''ہر ملک کے اپنے سماجی و ثقافتی ڈھانچے ہیں، جس میں خواتین آج بھی مختلف طرح کے صنفی مسائل اور جبر و استحصال سے دوچار ہیں اور پست و حاشیائی حیثیت کے ساتھ دوسرے درجہ پر فائز ہیں۔ دوسری طرف تانیثی تحریکات کے نتیجے میں سماجی سطح پر خواتین کی حیثیت کو لے کر شعور بھی بیدار ہوا ہے چنانچہ ان کی پست حیثیت کے اسباب و وجوہات کو جاننے کے متعلق رجحان بھی بڑھا ہے۔''

اس ضمن میں وہ ''مطالعاتِ نسواں'' کے عنوان سے ایک بین الکلیاتی (Interdisciplinary) مضمون کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ صنفی مسائل (Gender Issues) پر بات کرتی ہیں۔ خاندانی و سماجی سطح پر صنف کے سماجیانہ عمل (Socialization of Gender) صنفی کی تشکیل (Construction of Gender) کے عمل میں آنے کے پروسیس پر بھی بات کرتی ہیں۔ خواتین کے لیے ''گود سے لے کر گور تک'' کے نہ ختم ہونے والے مسائل کے سلسلوں کا ذکر کر کے تاریخی حقائق اور پھر حال تا مستقبل تک سفر سے روشناس کروا کر اپنی فکر میں قاری کو بھی شریک کر لیتی ہیں۔

آمنہ تحسین اپنے علم و عمل کی روشنی میں ادب کے ذریعے ان صنفی تصورات کا تجزیہ کرتی ہیں، جن کی وجہ سے آدھی دنیا کا جینا حرام ہے۔ نسائی ادب میں درج عدم مساوات کی بے شمار مثالوں سے ان کا قلم اپنا سفر طے کرتا ہوا دورِ حاضر کے سروکاروں سے بحث کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی فکر بڑے دوستانہ طریقے سے مسئلہ کی ہمدرد بن کر قاری کے ذہن میں امید جگاتی ہے اور رہنمائی کرتی ہے۔ مگر معلومات کے وافر ذخیرے سے اخذ مسائل اور عملی اقدامات پر وہ فیصلہ کُن حل نہیں دیتیں بلکہ مختلف النوع طریقے سے راستے بتاتی ہے۔ بشرطیکہ سماج میں سننے کی صلاحیت ہو۔ گویا وہ قاری کو اپنا ہم خیال بنا کر ہی چھوڑتی ہیں راز دار بنا کر ہی دم لیتی ہیں۔ لیکن ان کا قلم غیر جانبداری کا بھی خیال رکھتا ہے۔ مساوات کے صنفی تضادات کی دروپست کی کشمکش کو اپنے باطن کا حصہ بناتی آمنہ تحسین کی فکر اس میدان سے منسلک (Concerned) حقائق اور فکری مواد کی روشنی میں مشرقی تہذیب و کلچر پر استوار بنیادوں کی نئی عمارت پر بات کرتی ہیں۔ مسئلہ معاشی ہو، جنسی ہو، سماجی ہو یا سیاسی ہو۔ آمنہ تحسین ادب کی روشنی میں حالات کا مکمل جائزہ پیش کرتی ہیں۔ دلائل و ثبوت کے باہم حقیقت کے مسائل کو سامنے لاتی ہیں۔ انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ پر مثبت و منفی تناؤ میں توازن بیٹھنا بہت مشکل مرحلہ ہے۔ مثبت بلاشبہ صحیح سمت پر سفر کراتا ہے اور منفی تناؤ ڈپریشن کو جنم دے کر غلط راستے پر لے جاتا ہے۔ جسمانی، ذہنی، جذباتی اور عقیدت مندانہ حالات میں تناؤ آڑے آتا ہے۔ اکیڈمک مسئلہ، سماجی عدم مساوات کے پہلو، نشے اور جنسی جذباتیت میں غرق سوشل نیٹ ورکنگ اور خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے متعلق بیان کردہ اردو شعر و ادب کے ذریعے مثالیں دے کر آمنہ تحسین کی فہم ایک طریقے سے ''کاؤنسلنگ'' کا کام کرتی ہے جس کے نتیجے میں حوصلہ پست نہ ہو کر امید کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

مثال کے طور پر آمنہ تحسین کی کتاب ''سماج اور صنفی تصورات (ادب کے آئینے میں) کے مضامین کے عنوانات کو ہی سامنے رکھیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سماج میں عورتوں کے حقوق اور اس کی پاسداری کے اسباب و عِلل کس درجہ مثبت و منفی اثرات سے گزر کر آج اکیسویں صدی میں بھی بہترین نتائج سے محروم نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ مرد سماج کی فکری سطح بلند ہوئی ہے۔ لیکن عورت کو ''وِش کا پیالہ'' تو اب بھی پینا ہی پڑ رہا ہے۔ ''اب کے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' والی کربناکی ہر دوسرے تیسرے گھر کی دیواروں میں دم توڑتی نظر آتی ہے۔ لیکن ادیب اور نقاد اپنے عصری حالات سے مایوس نہیں ہے۔ قلم کا سپاہی ہے تو ان صورتِ حال کو بدلنے کے لیے ڈٹا ہوا ہے۔ آمنہ تحسین نے سماج، صنفی تصورات اور نسائی ادب، ادب میں تصورِ نسواں، صوفیاء کی دکنی شاعری کے حوالے سے، خواتین کی بدلتی حیثیت (آصف جاہی عہد کے حوالے سے) ہندوستانی سماج، عورت اور منٹو کا ادبی ڈسکورس، خواتین کی اردو شاعری میں نسائی حیثیت اور تانیثیت، خواتین کے افسانوں میں تانیثی افکار، اردو ڈرامہ میں صنفی مسائل کی پیش کش، طنز و مزاح نگاری اور خواتین کا احتجاج، کشمیر کے حوالے سے نسائی ادب میں سماجی عدم استحکام کی عکاسی، وغیرہ پر بڑی سنجیدگی سے لکھا ہے۔ ان کی یہ تحریریں سنجیدہ مطالعے کا تقاضہ کرتی ہیں۔ غور و خوص کی دعوت دیتی ہیں۔ ایک جوش اور ولولہ، ایک گہری خاموشی کے بطن سے شعور و آگہی کی کرنوں کا سنچار کرتی ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے ناول ''سمن'' کا یہ اقتباس آمنہ تحسین کے فکری انتخاب کی تشریح کرتا ہے:

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بات کو صحیح نہیں سمجھتی ہوں
یوسف صاحب ۔۔۔ مرد پیسے دیتے ہیں تو کیا عورتیں کام

نہیں کرتیں۔۔۔ مفت دیتے ہیں؟ دو بچوں کی ہی نگرانی کھانے کپڑے کے عوض بہت سستی ہے۔اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں۔دعویٰ ہے کہ ہمارے نظام میں مرد عورت برابر ہوں گے۔۔۔عورت کی برابری کا دعویٰ کرنے والے کمیونسٹ کے گھر میں میں نے دیکھا کہ بیوی پلنگ اٹھا رہی ہے۔جھاڑو دے رہی ہے، چائے لاکر ان کے سامنے رکھ رہی ہے اور ان کے جوتوں پر پالش کر رہی ہے اور وہ لیڈر بنے کرسیوں پر اخبار لیے بیٹھے ہیں۔''

(سماج اور صنفی تصورات، صفحہ 195۔)

عطیہ نورالحق قادری کی طنز و مزاح نگاری کے ضمن میں ان کے ایک مضمون'' کی ہم نے جب توبہ'' سے لیا گیا آمنہ تحسین کا یہ انتخاب اور اس میں طنز کی آنچ کا اندازہ لگائیے:

''ہائے صد افسوس کہ اس دنیا میں جو کرپشن رائج ہے وہ ادھر نہیں ورنہ کراماً کاتبین، منکر نکیر کی مالیت کا اندازہ لگتا ہی نہیں۔۔۔۔دارو غہء رضوان کے کھاتے سوئز بینک کی طرح مخفی ہوتے۔۔اعمال کی سوداگری چلتی، ٹینڈر بھرے جاتے، پھر وہ لوگ جو اپنے الٹ پھیر سے اس دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں، ان ہی کے محلات وہاں بھی ہوتے''

(کتاب سماج اور صنفی تصورات، صفحہ 161)

''ٹماٹر جو تقریباً ہر سالن اور دال کی ضرورت، سلاد کی زینت، صحت کی ضمانت اپنی جگہ کھو چکے ہیں۔
خریدنے کی سوچو تو ہاتھ ٹھٹھر رہے ہیں۔۔۔۔''

(مضمون مہنگائی مار گئی، صفحہ 161)

آمنہ تحسین نے اپنے ایک مضمون'' ہندوستانی سماج، عورت اور منٹو کا ادبی ڈسکورس'' میں عورت اور سماج، فحشیات پر لعن طن، طوائف، سرمایہ دارانہ نظام، جاگیردارانہ نظام وغیرہ پر اپنی فنی و فکری نظم کے سنجیدہ پہلو بیان کئے ہیں۔'' کلیات سعادت حسن منٹو'' جلد اول مرتبہ شمس الحق عثمانی سے لیا گیا ایک اقتباس اور اُس پر آمنہ تحسین کی فکری بصیرت ملاحظہ فرمائیے۔

''ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے۔اور کیوں نہ رہے؟
مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے؟ جب کبوتر، کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں؟ عورتیں کبوتریوں سے زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور فکر انگیز ہیں''۔

مذکورہ سطور پر تجزیہ کرتے ہوئے آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

''درجہ بالا سطور پر غور کیا جائے تو عورت کے متعلق سماج کا بنیادی نظریہ پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ ''عورت'' ابتدا ہی سے ''انسانی مخلوق'' نہیں بلکہ ایک ''سحر انگیز مخلوق'' تصور کی گئی اور صدیوں سے اسی حیثیت سے ادب کا حصہ بنتی رہی۔منٹو کی تحریر سے مذکورہ بالا اقتباس جہاں ''ہندوستانی سماج کے اذہان اور ان کی فکر کی عکاسی کرتا ہے وہیں ان سطور کا آخری جملہ '' عورتیں کبوتریوں سے زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور فکر انگیز ہیں'' ہماری توجہ اس جانب مبذول کرواتا ہے کہ جسے ہم ''منٹو کی فکری انفرادیت کہہ سکتے ہیں۔
منٹو نے اپنی تحریروں میں عورت کے صرف ''سحر خیز روپ'' کو پیش نہیں کیا بلکہ ان کے ''فکر خیز وجود'' کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی تحریروں کا حصہ بنایا''

آگے آمنہ تحسین منٹو کے عورت کرداروں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ:

''یہ کردار اپنے تمام تر نامساعد حالات میں بشری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس طرح ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ہم انھیں صرف ایک ''بنی نوع انسان'' کی حیثیت سے دیکھنے اور ان کے عمل و ردعمل کو سمجھنے لگتے ہیں۔
یہی منٹو کی فکر اور اسلوب کی انفرادیت ہے کہ انھوں نے ''سماج کی ناپسندیدہ عورت'' کے انسانی روپ کو پیش کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔''(صفحہ 99-100)

متذکرہ بالا جائزے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک تانیثی نقاد کی حیثیت سے آمنہ تحسین کی صلاحیتیں نئی فکر و آگہی کا پتہ دیتی ہیں۔ تانیثی تنقید ادب پاروں کو جانچنے اور پرکھنے کا نیا نظریہ ہے۔جس کو آمنہ تحسین نے بہ حسن خوبی پروان چڑھایا ہے۔ وہ اس میدان کی نباض کی حیثیت سے اردو نقدِ ادب کو کچھ ایسا دے رہی ہیں جو منفرد بھی ہے اور سنجیدہ مطالعے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

Prof. Sarvat Khan
Mohanlal Sukhadia University
Udaipur-313001, (Rajasthan)
amtahseen123@yahoo.com

ڈاکٹر حبیب النساء بیگم

ناول ’کالا پانی‘ کا تنقیدی جائزہ

محمد مبین کو ادبی دنیا میں ایم مبین کے نام سے جانا جاتا ہے۔ایم مبین 2 جون 1958 کو ایوالہ ضلع ناسک میں پیدا ہوئے۔بھیونڈی تھانے کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ایم کام، جی ڈی سی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ناگرک سہکاری بینک بھیونڈی میں مینیجر کے عہدے پر فائز رہے۔ایم مبین نے افسانے، ناول، یک بابی ڈرامے اور بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔آپ نے چالیس سے زائد کتابیں شائع کیں جو مختلف اصناف سخن کا احاطہ کرتی ہیں اور اردو زبان وادب کا حصہ بن چکی ہیں۔

’’کالا پانی‘‘ انڈومان کی سیلولر جیل کے پس منظر میں لکھا گیا ایک تاریخی ناول ہے۔جس کی اشاعت 2016 میں ہوئی۔128 صفحات پر مشتمل اس ناول میں وطن سے محبت کی داستان ہے۔جس کے ایک ایک لفظ سے حب الوطنی کے جذبہ کی خوشبو مہکتی ہے۔اس ناول کو سنجیدگی سے پڑھنے والا حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو جاتا ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندوستانیوں نے جو قربانیاں دی ہیں اس سے اچھی طرح آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں آزادی کی اہمیت و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

یہ ناول تین جگری دوستوں کی کہانی ہے جو اپنے وطن ہندوستان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور وطن کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ایک روز سلیم رحمانی کی امی اسے جگا کر کہتی ہے کہ تیرا دوست فاروق آیا ہے۔فاروق کے ذریعے سلیم اور مجید کو یہ خبر ملتی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کو انگریزوں نے جھوٹے کیس میں پھنسا کر گرفتار کر لیا ہے۔اس بات کا اثر سلیم، فاروق اور مجید کے دل و دماغ پر اس قدر ہوتا ہے کہ یہ تینوں اس کے خلاف کھل کر احتجاج کرنے کے لیے انجام کی پرواہ کیے بغیر تیار ہو جاتے ہیں۔وہ اپنے گاؤں ’’ولی پور‘‘ کی پولیس چوکی پر دھاوا بول کر بندوقیں ان سے چھین لیتے ہیں اور پولیس کے جوانوں کو جیل میں بند کر کے بندوقیں سمیت سارا سامان جلا دیتے ہیں۔1921 کی ترکی خلافت تحریک میں عملی طور پر حصہ لینے کے جرم میں مولانا محمد علی جوہر کو گرفتار کیا گیا تھا۔جس کے ردعمل کے طور پر یہ تینوں دوست انگریزوں سے بغاوت پر اتر آتے ہیں۔گاؤں میں افراتفری مچ جاتی ہے۔چاروں طرف پولیس کا پہرہ لگا دیا جاتا ہے۔تینوں دوستوں کو گھر سے باہر ایک سوکھے کنویں میں چھپنا پڑتا ہے۔چاروں طرف ان تینوں کو تلاش کیا

جاتا ہے۔گاؤں میں ایک ایک کو پکڑ کر ان کا پتہ پوچھا جاتا ہے۔ پتہ نہیں ملنے پر انگریزی حکومت کا ظلم گاؤں والوں پر حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ انگریزوں نے گاؤں والوں کا جینا مشکل کر دیا تھا۔کسی کو بھی گرفتار کر کے لے جاتے اور انھیں جانوروں کی طرح کوڑے مار کر ان سے تینوں کا پتہ پوچھتے۔سینڈرس کی زبانی سنیے:

آم کو کسی بھی ٹرح ان تینوں کا خبر مانگتا۔ہم کو اوپر سے آرڈر آیا ہے۔ 24 گھنٹے کے اندر باغی گرفتار ہونے منگتا'' سینڈرس دہاڑ کر بولا۔

(ص22)

سلیم، فاروق اور مجید کے بچپن کا ساتھی ''داؤد'' اس کنویں سے واقف تھا وہ اس کنویں کے پاس آ کر شائستہ آواز میں کہتا ہے کہ انگریزوں کا گاؤں والوں پر ظلم حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے اور ان تینوں کے گھر والوں کو پولیس نے مار مار کر ادھ مرا کر دیا ہے۔گاؤں والوں نے یہ طے کیا ہے کہ تم تینوں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں تو تمھارے گھر والوں کو انگریزوں کے ظلم سے نجات مل سکتی ہے۔ یہ سنتے ہی تینوں آنسو بہاتے ہوئے کنویں سے باہر آتے ہیں۔سینڈرس تینوں کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرتا ہے اور ان تینوں کو دس سال ''کالے پانی'' کی سزا ہو جاتی ہے۔ان تینوں کو دوسرے کئی قیدیوں کے ساتھ انڈومان کی سیلولر جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں پہلے سے کئی قیدی موجود ہیں۔تمام قیدیوں کے ساتھ سلیم، فاروق اور مجید پر بھی یہاں ایک عرصے تک مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ یہاں کا جیلر بڑا ظالم اور سخت مزاج تھا۔اس زمانے میں جیل ایک ڈراؤنے خواب جیسی تھی۔ یہاں سے کوئی فرار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے ایک طرف گھنا جنگل تھا۔ یہاں چھپے مقامی باشندے اجنبی اکیلے شخص پر زہر میں بجھا تیر چلا کر اسے ختم کر دیتے تھے۔کیونکہ یہ جیل ایک جزیرے میں واقع تھی۔اس لیے چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا جس کا رنگ بظاہر دیکھنے پر کالا نظر آتا تھا اور اسی وجہ سے اس جیل کی سزا کو ''کالے پانی'' کی سزا کہا جاتا تھا۔ بقول ناول نگار:

''وہ سیلولر جیل جو انڈومان نکوبار جزیرے میں واقع تھی۔ اس جزیرے کو آباد کرنے کا کام انگریزوں نے 1805 میں شروع کیا تھا۔دراصل پورا انڈومان چھوٹے چھوٹے 250 جزیروں کا مجموعہ تھا۔اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔گیا تھا۔ شمالی انڈومان، درمیانی انڈومان اور جنوبی انڈومان۔سیلولر جیل جہاں بنائی گئی تھی اس کے قریب ہی پورٹ بلیئر جیسی بندرگاہ تھی۔'' (ص83)

انڈومان کے اطراف سمندر ہے جس سے خشکی ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔اس لیے یہاں سے فرار ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔فرار ہونے کی کوشش کرنے والے مقامی باشندوں کا شکار ہو جاتے تھے یا گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھ جاتے تھے۔ پھانسی دیتے وقت تمام قیدیوں کو یہ منظر دیکھنا لازمی تھا۔ جو اُسے نہیں دیکھتا اُس پر کوڑے برسائے جاتے تھے۔

سیلولر جیل میں رہنے کی جگہ قیدیوں کے لیے انتہائی خراب تھی، کھانا خراب دیا جاتا تھا۔ان سے بہت سخت کام لیا جاتا تھا اور کام کرتے وقت قیدیوں پر کوڑے برسائے جاتے تھے۔ اس جیل میں قیدیوں کو مختلف سزائیں دی جاتی تھیں۔اس جیل کا جیلر بہت ظالم انسان تھا جو یہاں کی عدالت کا جج بھی ہوتا تھا۔ یہاں کے قیدیوں کو معمولی معمولی غلطیوں پر طرح طرح کی سزائیں دیتا تھا۔ان سزاؤں میں کھلے جسم پر کوڑے برسانا، کال کوٹھری کی سزا، کھڑی ہتھکڑی کی سزا اور انسانی پیشاب پلانے سے لے کر پھانسی تک کی سزا شامل تھی۔ناول میں بتایا گیا ہے کہ:

''ایک کمرے میں قیدی کو دیوار سے کھڑا کر دیا جاتا تھا۔اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگا کر اس کا ہُک دیوار میں لگے ایک ہُک میں پھنسا دیا جاتا تھا۔اس سے یہ وہ ہوتا تھا کہ قیدی کو صرف کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ نہ تو وہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ جھک سکتا تھا۔کبھی کبھی تو اسے سزا کے لیے دو دو تین تین دن کھانا نہ دیا جاتا تھا اور نہ پانی اور نہ حاجت رفع کرنے کی سہولت دی جاتی تھی۔'' (ص71)

ان سزاؤں سے تنگ آ کر، ان سزاؤں کو سہتے سہتے مجبور ہو کر سیلولر جیل کے کئی قیدی فرار ہونے کی کوشش میں مارے جاتے تھے یا سزاؤں کے دوران تکلیف کی تاب نہ لا کر مر جاتے تھے یا پھانسی پر چڑھ جاتے تھے۔سیلولر جیل میں سیاسی قیدیوں کے حب الوطنی جذبے کو دل و دماغ سے نکالنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے تھے۔جن قیدیوں کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا تھا انھیں قیدِ تنہائی دی جاتی تھی جو بہت ہی اذیت بھری سزا ہوتی تھی جسے برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔

سلیم، فاروق اور مجید انصاری تینوں کو سیلولر جیل کے جیلر نے ان کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کی بنیاد پر انھیں ''قید تنہائی'' کی سزا دی جس کی وجہ سے تینوں دوستوں کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کیا گیا تھا۔سلیم کو جس کال کوٹھری میں بند کیا گیا تھا اُس سے لگ کر جو کوٹھری تھی اُس میں پہلے سے ہی ایک قیدی بند تھا۔جس کا نام وپن دت تھا اور جو چھ مہینوں سے

زیادہ اسی سزا کو بھگت رہا تھا۔ یہ بنگالی تھا اور ڈھاکہ سے لایا گیا تھا۔

سلیم بڑی تکلیف میں اپنی سزا بھگت رہا تھا۔ اُسے نہ تو فاروق کا حال معلوم تھا اور نہ مجید کا۔ ظاہر ہے یہ دونوں بھی اسی عذاب میں تھے جس میں سلیم تھا۔ قید تنہائی پوری کرنے کے بعد سلیم کو دوسرے قیدیوں کی طرح مختلف کاموں پر لگایا گیا۔ جیسے ناریل کا چھلکا کوٹنے کا کام، رسی بنانے کا کام، یا پھر تیل نکالنے کا کام، ہر کام بہت مشکل تھا۔ ناریل کا چھلکا کوٹتے کوٹتے پہلے دن سلیم کے ہاتھ چھل گئے۔ بدن درد کرنے لگا۔ پھر بھی اس سے ہر طرح کے کام لیا جاتا تھا۔ قیدیوں کو کام کے دوران سُستی کرنے یا کسی سے بات کرنے پر پہرے دار کوڑے برساتے تھے اور کڑی محنت کا کام لے کر ان کو بہت خراب کھانا اور بہت کم مقدار میں دیا جاتا تھا۔

سیلولر جیل کی سزا کے دوران ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب تینوں دوست مل جاتے ہیں۔ تینوں دوست ایک دوسرے کو سہی سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ سلیم، فاروق اور مجید ان تینوں کا ایک نئی عمارت بنانے کے کام کے سلسلے میں جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے کام پر لگایا جاتا ہے۔ جہاں یہ تینوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ تینوں ایک ساتھ پچاس قیدیوں کے ساتھ لکڑیاں کاٹنے کے کام میں لگ جاتے ہیں۔ جنگل کے منتخب درختوں کی لکڑیاں جن کا انتخاب عمارت بنانے والے انجینئر خود کرتے تھے۔ قیدیوں سے کٹوائے جاتے تھے۔ یہ کام بھی بہت مشکل تھا۔ اُس پر ایک اور مصیبت یہ آن پڑی کہ اسی دوران برسات ہونے لگی جس کی وجہ سے کٹائی کا کام اور بھی مشکل ہو گیا۔ کام کی رفتار سُست ہو گئی۔ برسات کی وجہ سے کیچڑ ہو گیا۔ کٹی ہوئی لکڑیاں عمارت تک لے جانا انتہائی دشوار ہو گیا تھا۔

سُست رفتاری کی وجہ سے پہرے دار، قیدیوں پر کوڑے برسانے لگتے اور پہرے داروں پر انجینئر کوڑے برسا کر اپنا غصہ اتارنے لگتا۔ اسی دوران مجید ایک پہرے دار سے اُلجھ جاتا ہے۔ بحث کے دوران ایک پہرے دار مجید پر کوڑے برسانے لگتا ہے۔ مجید کو طیش آ جاتا ہے اور وہ غصے میں کلہاڑی سے پہرے دار پر حملہ کر کے اُسے ختم کر دیتا ہے۔ وہ یہ حملہ اچانک کر دیتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے پہرے دار سہم جاتے ہیں۔ ایک پہرے دار اُس پر نشانہ تان کر بندوق چلا دیتا ہے۔ مگر اس گولی سے وہ کسی طرح بچ جاتا ہے اور جنگل کی جانب فرار ہو جاتا ہے۔ سلیم اور فاروق یہ منظر دیکھ کر غم میں ڈوب جاتے ہیں کیونکہ انھیں مجید کی موت نظر آتی ہے۔ حملہ کرتے وقت سلیم مجید کو روکنے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ مگر مجید کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے اور وہ مسلسل کئی وار کر کے پہرے دار کو ختم کر دیتا ہے۔ جب مجید جان بچانے کی خاطر جنگل کے اندر چلا جاتا ہے تو سلیم اور فاروق کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ان کے کانوں میں گولیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ ان کی نگاہیں جنگل کی جانب لگی رہتی ہیں بہت دیر بعد پہرے دار ایک آدمی کو گھسیٹ کر لاتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر سلیم اور فاروق اُسے پہچان لیتے ہیں۔ اُس کے سینے میں ایک تیر پیوست نظر آتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر سلیم اور فاروق صدمے سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ انھیں اپنے دوست مجید کی موت کا بہت افسوس ہوتا ہے۔

انڈومان کی جیل میں قیدی کے مرنے کے بعد اسے ایک بورے میں باندھ کر سمندر کے پانی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ مجید کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ سلیم اور فاروق بے بس اور مایوس بس دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ سلیم سوچتا ہے کہ مجید کی شہادت کی خبر اُس کے گھر والوں کو وہ ضرور دے گا مگر سلیم کو اس کا موقع ہی نہیں مل پاتا۔

عمارت کا کام تیزی سے کرنے کے لیے جیلر قیدیوں کی ایک میٹنگ لیتا ہے اور قیدیوں کو تیزی سے کام کرنے کے لیے سخت جملے کہتا ہے۔ قیدیوں کو بھی غصہ آ جاتا ہے اور سارے قیدی ظلم کے خلاف احتجاج کرنے لگتے ہیں۔ اس بات پر جیلر اور پہرے دار قیدیوں پر کوڑے برسانا شروع کر دیتے ہیں۔ قیدیوں میں شور بلند ہوتا ہے کہ اس جیلر کو ختم کر دو سارا ظلم ختم ہو جائے گا۔ فاروق آگے بڑھ کر اس جیلر کا کوڑا چھین لیتا ہے اور اُسی کوڑے سے جیلر کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پہرے دار فاروق کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ اس جُرم میں فاروق کو پھانسی کی سزا ہو جاتی ہے۔ سلیم دونوں دوستوں کی موت کا ذمہ دار خود کو مان کر بہت روتا ہے اور اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے۔ قیدیوں کا کام پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ سلیم کھویا کھویا سا رہتا ہے کام میں اس کا دھیان نہیں رہتا ہے اور ہر وقت وہ کوڑے کھاتا ہے مگر اب اسے کوڑے کھانے کا بھی ڈر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوڑوں کا درد محسوس ہوتا ہے۔

کچھ روز بعد تمام سیاسی قیدیوں کو ایک ساتھ ایک الگ جیل میں رکھا جاتا ہے۔ یہ سارے قیدی ہندوستان سے لائے گئے تھے اور سارے کے سارے حب الوطنی کے جذبے کے جرم میں گرفتار ہو کر ''کالے پانی'' پہنچے تھے۔ سارے قیدی مل کر دس قیدیوں کو چن کر لیڈر بنا دیتے ہیں۔ یہ لیڈر جیل میں اپنی مانگیں رکھ کر بھوک ہڑتال کروا دیتے ہیں۔ چار پانچ دن بھوک ہڑتال جاری رہتی ہے۔ سارے قیدی بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ جیلر ان کی ہڑتال ختم کرنے کے لیے ان پر مزید ظلم شروع کر دیتا ہے وہ انھیں انسان کا پیشاب پلانے کے لیے پہرے

داروں سے کہتا ہے۔ سب سے پہلے ایک لیڈر کو پکڑ کر زبردستی پیشاب پلایا جاتا ہے۔ بقول نگار:

''اب اس کو خالص انسانی پیشاب پلا کر اس کی بھوک ہڑتال تڑوائی جائے گی'' جیلر وحشیانہ انداز میں ہنسا شروع کر دیا''(ص125)

جب دوسرے لیڈر کی باری آتی ہے تو سارے قیدی گرتے پڑتے احتجاج کرنے لگتے ہیں اور جیلر کی جانب بڑھنے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر جیلر گولیاں چلانے کا حکم پہرے داروں کو دیتا ہے۔ پہرے دار اندھا دھند قیدیوں پر گولیاں چلانے لگتے ہیں۔ انسانی چیخوں اور گولیوں کی آوازوں سے جیل خانہ گونج اٹھتا ہے۔ ہر طرف لاشیں اور خون ہی خون نظر آتا ہے۔ ایک گولی آ کر سلیم کے سینے میں اُتر جاتی ہے اور وہ کلمہ پڑھ کر کہہ کر اپنا دم توڑ دیتا ہے۔ اس طرح سے ناول ایک دردناک انجام پر ختم ہو جاتا ہے۔

ناول کا قصہ تین دوستوں کے حب الوطنی کے جذبے پر مبنی ہے۔ جنھیں اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی اور اپنے وطن کے لیے انھوں نے جان قربان کر دی۔ اس کہانی کے ساتھ کچھ اور بھی واقعات ہیں جو کہانی کو موثر بناتے ہیں۔ یہ ناول ''کالا پانی'' کے قیدیوں کی زندگی کے انتہائی تکلیف دہ واقعات کی عکاس کرتا ہے۔ اس لیے اس میں عورت کے کردار کی گنجائش نہیں تھی۔ خود ناول نگار نے تحریر کیا ہے۔

''انڈومان کی سیلولر جیل کے بارے میں جب میں نے کئی کتابیں پڑھیں تو وہاں کے حالات اور واقعات پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ہمارے بزرگوں نے ملک کی آزادی کے لیے کیسی کیسی تکلیفیں جھیلیں آج نہ تو کوئی ان کا ذکر کرتا ہے اور نہ اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ تب سے میں نے ذہن بنا لیا تھا کہ اس پس منظر پر کوئی ناول لکھوں گا تا کہ نئی نسل تک اس تاریخ کی ایک ہلکی سی جھلک اور اس کا تصور تو پہنچے۔''(ایم مبین اپنی بات۔ص3)

اس ناول کا سب سے اہم حصہ اس ناول میں شامل وہ بیانات ہیں جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کالے پانی کی سزا کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کون سی سزائیں ہیں جو اس قید خانے میں دی جاتی تھیں۔ جیسے:

1 لوہے کی رکابی اور جگ دروازے کے باہر ہی رکھ دیا گیا۔ کھانے کے وقت اس میں کھانا دیا جاتا تھا۔ کمرہ پتھروں سے بنا تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی اور قیدی ہوں گے لیکن کون ہے اس کا پتہ لگانا مشکل تھا۔

2 کوڑا قیدی کے جسم پر پڑ رہا تھا۔ ہر کوڑے کے ساتھ اس کی پشت پر خون کی لکیریں ابھر رہی تھیں۔ اس کی ساری پشت لہولہان ہو گئی تھی۔ اس کے جسم سے خون ٹپک رہا تھا۔ پہلے وہ جانوروں کی طرح چیخ رہا تھا لیکن دھیرے دھیرے شاید اس میں چیخنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے بے ہوش ہو جانے پر بھی کوڑے برسانا جاری رہا۔

3 یہاں بھی عدالت ہے؟ اس میں بھی مقدمہ چلتا ہے؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیسی عدالت بھائی۔ عدالت کا جج بھی یہی ظالم جیلر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی مرضی کا ہی فیصلہ کرتا ہے۔ یہاں پر اس کے بنائے قانون ہیں اور وہی قانون چلتا ہے۔ کاغذی خانہ پوری کرنے کے لیے مقدمہ چلایا جاتا ہے جو ایک گھنٹہ میں ختم ہو جاتا ہے اور فیصلہ سنا دیا جاتا ہے''۔ میں نے بتایا۔

ناول کی کہانی حقیقی واقعات سے انتہائی قریب ہے اور بڑی موثر و پر درد ہے۔ اس ناول کو پڑھنے سے قاری کے دل میں وطن سے محبت کا جذبہ جاگتا ہے۔

ناول میں تمام واقعات اس طرح سے پیش آتے ہیں کہ کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا۔ ناول پڑھتے وقت قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ یہ ناول رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ ناول پڑھتے وقت قاری کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ناول پڑھ کر نئی نسل کے نوجوانوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ناول میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اور جس طرز سے ناول نگار نے بیان کیے ہیں وہ قاری کو ناول سے باندھے رکھتے ہیں۔ یہ ناول ایک ہی نشست میں ختم کرنے کے قابل ہے۔ ایک تو یہ مختصر ہے دوسرے نہایت جامع اور موثر ہے۔ غزل کی زبان میں بات کی جائے تو ناول نگار نے دریا کو کوزے میں سمونے کی کوشش کی ہے اور ناول نگار اس میں کافی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔

اس ناول میں سب سے اہم کردار ''سلیم رحمانی'' کا ہے۔ یہی ناول کا ہیرو ہے۔ اسی سے ناول کا آغاز کیا گیا ہے اور اسی پر ناول کا اختتام ہوتا ہے۔ سلیم ایک حب الوطن، جذباتی، سچا، ہمدرد اور مخلص انسان ہے۔ ولی پور نام کے مہاراشٹر ریاست کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا باشندہ ہے۔ سلیم کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ اتنا کوٹ کوٹ کو بھرا ہوا ہے کہ وہ

اس کی خاطر ہر ظلم کو سہہ لیتا ہے۔ وطن سے اس کا عشق جنون کی حد تک ہے۔ اسی عشق میں وہ اپنے آپ کو ایک پروانے کی طرح قربان کر دیتا ہے۔ سلیم رحمانی کے علاوہ فاروق اور مجید کا کردار بھی بہت اہم ہے جو اپنے وطن پر جان قربان کر دیتے ہیں ۔ ناول میں کوئی خاص نسوانی کردار نہیں ہے۔ اس ناول میں ہیروئن نہیں ہے۔ ناول کی ابتدا میں سلیم کی ماں سلیم کو اس کی دوست کی آمد پر جگاتے ہوئے دکھائی گئی ہے۔

یہ ایک تاریخی ناول ہے اس میں بیان کیے گئے تقریبا سبھی واقعات جنگ آزادی کی لڑائی کا حصہ ہیں ۔ 1921 میں مولانا محمد علی جوہر کو جب خلافت تحریک کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تو ملک میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ حب الوطنی کے جذبے نے کئی ہندوستانیوں کو احتجاج کرنے مجبور کر دیا تھا۔ اِسی سے جڑے واقعات کا بیان اس ناول میں ہے۔ ان بیانات کو ناول نگار نے بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔

ناول نگار نے انتہائی سادہ اور سلیس زبان میں ناول تخلیق کیا۔ اس میں استعمال کیے الفاظ عام فہم ہیں اور جملے بھی رواں ہیں کہیں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور نہ ہی فلسفیانہ بیانات کی بھرمار ہے۔ ایم مبین نے سلیم سے جو جملے کہلوائے وہ ہر ہندوستانی (جو محبِّ وطن ہے) کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً:

''میں بھی ان باتوں کو سمجھتا ہوں کہ مجھے بات بات پر مشتعل نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میں مولانا اور تحریک کے بارے میں کوئی بات سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہوں۔

''اف! اتنی معمولی معمولی باتوں کی اتنی بھیانک سزا۔''

(ص59)

ناول کی منظر نگاری بھی قابل تحسین ہے۔ ناول میں انڈومان جزیرے کا منظر اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے جزیرے کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ سیلولر جیل کا ہر ایک منظر قاری پر رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اس ناول کی کہانی ہی ایسی پُر درد ہے کہ اس میں منظر کشی کی زیادہ گنجائش نہیں تھی اس کے باوجود ناول نگار نے کہیں کہیں عمدہ منظر نگاری کی ہے جیسے:

''خوبصورت گھنے درختوں کے بیچ ایک اونچے چبوترے پر وہ درگاہ بنی ہوئی تھی۔ پیڑوں کی گھنی، ٹھنڈی چھاؤں اور ٹھنڈی ہوائیں دل کو بڑا سکون دیتی تھیں۔ وہ تینوں اکثر اس درگاہ پر جا کر گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔'' (ص11)

''سامنے جزیرے پر جو پہاڑوں اور چٹانوں کا سلسلہ دکھائی دیتا تھا وہ بھی سیاہ پتھر کا تھا۔ چٹانیں اور پہاڑیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔'' (ص47)

اس ناول کے زماں و مکاں پر بات کی جائے تو 2016 کا تخلیق کردہ یہ ناول 1900 تا 1925 کا احاطہ کرتا ہے اور اس کی اصل کہانی کا وقفہ تو 5 سال سے بھی کم ہے ۔ یعنی 1921 میں مولانا محمد علی جوہر کی گرفتاری سے شروع ہو کر سلیم، فاروق، اور مجید کی گرفتاری اور اُن کے دو تین سال کی سزا کے واقعات پر ختم ہو جاتا ہے۔ ناول کی دلچسپی قائم رکھنے میں اس کا محدود وقفہ بھی کارآمد ثابت ہوا ہے۔ یہ ناول مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے گاؤں ولی پور سے شروع ہوتا ہے اس میں مقامی پولیس ،گاؤں، ضلع اور پونہ، مدراس شہر کے بعد انڈومان نکوربا کی سیلولر جیل اور انڈومان نکوربا کے جزیروں کا ذکر ہے۔

سماجی ناولوں کی طرح تاریخی ناولوں میں بھی تجسس قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ ''کالا پانی'' خلافت تحریک، عدم تعاون تحریک، آزادی کی لڑائی اور حب الوطنی کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس میں 1857 کے بعد کے انگریزوں کے مظالم تاریخی پس منظر میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس لیے تجسس اس ناول کا اہم حصہ نہیں لیکن ایم۔ مبین نے واقعات کو بہت عمدگی سے ترتیب دیا ہے۔ تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اسی لیے ناول کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔ اس ناول کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک مکمل، پُر اثر و جامع ناول ہے۔ حالانکہ اس کے صفحات صرف 128 ہیں۔ اس میں بھی صفحہ نمبر ۵ سے اس ناول کا آغاز ہوتا ہے اور 125 پر اس کا اختتام۔ اس اعتبار سے بھی 121 صفحات ہی اس ناول کا حصہ ہیں اور ان صفحات پر بھی جملہ 23 تصاویر ہیں جن سے کچھ صفحات اور کم ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کا اختصار ہی اس کی کشش میں زیادہ اضافہ کرنے کا ضامن ہے۔

ایم۔ مبین کا ناول ''کالا پانی'' مبالغہ آرائی سے پاک ہے۔ واقعات کو بیان کرنے کے لیے جو الفاظ، جو جملے اور جو خیالات پیش کیے گئے ہیں جیل اور جیل میں رہنے کا ایسا ماحول بناتے ہیں کہ لگتا ہے کہ یہ سب ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ اس ناول کے مطالعے سے ناول نگار کی قابلیت، محنت، وطن سے محبت اور وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

انڈومان نکوربا کے موضوع پر جوگیندر پال نے بھی ''پار پڑے'' کے عنوان سے ایک ناول تخلیق کیا ہے۔ ایم مبین کا ناول ''کالا پانی'' بھی انڈومان نکوربا کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ مگر یہ جوگیندر پال کے ناول

تنویر اختر رومانی

کہکشاں پروین کا افسانہ 'ٹھنڈی چائے' ایک تجزیہ

صوبۂ بہار سے انقطاع کے بعد ادبی اثاثے کے طور پر جو تین خواتین قلمکار (بشمول ڈاکٹر انوری بیگم اور ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم) ہی جھارکھنڈ کے حصّے میں آئیں، ان میں سرِ فہرست کہکشاں پروین (وفات: 17/جون 2024) کا نام آتا ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی اور سینیریٹی کے لحاظ سے بھی۔

ڈاکٹر کہکشاں پروین متحدہ بہار کے وقت سے اپنے قلم کے جوہر دکھاتی آرہی تھیں۔ وہ 1978 میں اپنے افسانے ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' کے ساتھ ادب میں وارد ہوئی تھیں اور تب سے اب تک ان کے قلم نے تساہلی نہیں برتی۔ موصوفہ نے افسانوں کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری میں بھی اپنی شناخت قائم کر رکھی ہے۔ شاعری سے بھی انھیں شغف تھا۔ ادبی دنیا میں انھیں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست سے ہی ان کی ادبی قد آوری کا اندازہ ہوتا ہے۔

44/برسوں کی طویل خدمات کے طور پر کہکشاں پروین کے افسانوں کے پانچ مجموعے

1۔ایک مٹھی دھوپ (1986)
2۔دھوپ کا سفر (1990)
3۔سرخ لکیریں (1998)
4۔پانی کا چاند (2009)
5۔مور کے پاؤں ((2019)

اور پانچ ہی تنقیدی تصانیف

1۔صالحہ عابد حسین بہ حیثیت ناول نگار (1991)
2۔منٹو اور بیدی کا تقابلی مطالعہ (2002)
3۔شیشۂ افکار (2015)
4۔نظریۂ ادب (2016)
5۔منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کردار کا نفسیاتی تجزیہ ((2022)

اور ایک شعری مجموعہ ''کیا رشتہ ہے مرا'' (2010) منصۂ شہود پر آکر قبولیت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

اور چند ماہ قبل تک نہ تو موصوفہ کے ہاتھوں میں لرزش آئی تھی اور نہ ہی ان کے قلم کی سیاہی خشک ہوئی تھی۔ گاہے گاہے ان کے رشحاتِ قلم رسالوں/اخباروں کی زینت بنتے رہے ہیں۔

زیر تجزیہ افسانہ ''ٹھنڈی چائے'' کہکشاں پروین کے 31/ افسانوں کے مجموعے ''مور کے پاؤں'' کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ''ٹھنڈی چائے'' کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے، جس کا تعلق ایک جوڑے کی ازدواجی زندگی سے ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ''وہ'' ایک سنجیدہ، متین، خود آگاہ، تعلیم یافتہ، سلیقہ

تنویر اختر رومانی

کہکشاں پروین کا افسانہ 'ٹھنڈی چائے' ایک تجزیہ

صوبۂ بہار سے انقطاع کے بعد ادبی اثاثے کے طور پر جو تین خواتین قلمکار (بشمول ڈاکٹر انوری بیگم اور ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم) ہی جھارکھنڈ کے حصّے میں آئیں، ان میں سرِ فہرست کہکشاں پروین (وفات: 17/جون 2024) کا نام آتا ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی اور سینیریٹی کے لحاظ سے بھی۔

ڈاکٹر کہکشاں پروین متحدہ بہار کے وقت سے اپنے قلم کے جوہر دکھاتی آرہی تھیں۔ وہ 1978 میں اپنے افسانے ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' کے ساتھ ادب میں وارد ہوئی تھیں اور تب سے اب تک ان کے قلم نے تساہلی نہیں برتی۔ موصوفہ نے افسانوں کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری میں بھی اپنی شناخت قائم کر رکھی ہے۔ شاعری سے بھی انھیں شغف تھا۔ ادبی دنیا میں انھیں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست سے ہی ان کی ادبی قد آوری کا اندازہ ہوتا ہے۔

44/برسوں کی طویل خدمات کے طور پر کہکشاں پروین کے افسانوں کے پانچ مجموعے

1۔ایک مٹھی دھوپ (1986)
2۔دھوپ کا سفر (1990)
3۔سرخ لکیریں (1998)
4۔پانی کا چاند (2009)
5۔مور کے پاؤں ((2019)

اور پانچ ہی تنقیدی تصانیف

1۔صالحہ عابد حسین بہ حیثیت ناول نگار (1991)
2۔منٹو اور بیدی کا تقابلی مطالعہ (2002)
3۔شیشۂ افکار (2015)
4۔نظریۂ ادب (2016)
5۔منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کردار کا نفسیاتی تجزیہ ((2022)

اور ایک شعری مجموعہ ''کیا رشتہ ہے مرا'' (2010) منصۂ شہود پر آکر قبولیت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

اور چند ماہ قبل تک نہ تو موصوفہ کے ہاتھوں میں لرزش آئی تھی اور نہ ہی ان کے قلم کی سیاہی خشک ہوئی تھی۔ گاہے گاہے ان کے رشحاتِ قلم رسالوں/اخباروں کی زینت بنتے رہے ہیں۔

زیر تجزیہ افسانہ ''ٹھنڈی چائے'' کہکشاں پروین کے 31/ افسانوں کے مجموعے ''مور کے پاؤں'' کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ''ٹھنڈی چائے'' کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے، جس کا تعلق ایک جوڑے کی ازدواجی زندگی سے ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ''وہ'' ایک سنجیدہ، متین، خود آگاہ، تعلیم یافتہ، سلیقہ

شعار اور شائستہ دوشیزہ ہے۔ وہ گرم چائے کی بجائے ٹھنڈی چائے پینا پسند کرتی ہے۔ فطری اعتبار سے وہ خود بھی ''ٹھنڈی'' ہے۔ لہٰذا شادی کے بعد بھی اس کی یہ ٹھنڈک برقرار رہتی ہے۔ اس کے شوہر ارشد کو اس کی یہ ''ٹھنڈک'' پسند نہیں آتی۔ اس نے ایک بار اس امر کی شکایت بھی کی۔ شوہر کی خوشنودی کی خاطر اس نے ایک بار اپنی فطری ٹھنڈک کو تج کر گرم جوشی کا ثبوت دیا۔ لیکن اس کی یہ از حد گرم جوشی اور وارفتگی بھی ارشد کو راس نہیں آتی۔ بالآخر دونوں کے رشتے تلخیوں پر منتج ہوتے ہیں اور شوہر کے اہانت آمیز رویے سے ایک سرد لہر اس کے وجود کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ جیسے مفلوج سی ہو جاتی ہے اور دائمی طور پر ایک برفیلی چائے بن جاتی ہے۔

دراصل اس افسانے میں ٹھنڈی چائے کو کہکشاں پروین نے ایک استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ موصوفہ نے بڑے فطری اور فنی انداز میں زن وشو کی ازدواجی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ گرچہ میری نگاہ میں اس افسانے کا کینواس بہت چھوٹا ہے۔ لیکن معاشرتی حقائق کے لحاظ سے اس میں ایک بڑا افسانہ بننے کے اوصاف موجود ہیں۔ کہکشاں پروین نے اپنی شگفتہ تحریر سے افسانے کو اس طرح پھیلایا ہے کہ بادی النظر میں کہانی کے کینواس کے مختصر ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ بھی فنی جمال ہے۔ اگر ہم ہندوستانی معاشرت پر نظر غائر ڈالیں تو یہ معاملہ بیشتر ازدواج کے مابین پیش آتا ہے۔ کہکشاں پروین نے جس انداز سے اس افسانے کی بُنت کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور جملوں، فقروں کی تراش خراش پر ان کی چابکدستی بدرجۂ کمال ہے۔

سیکس/جنس انسانی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ پیٹ کی بھوک کی طرح جنس/جسم کی بھوک انسان کی فطری ضرورت ہے۔ اس معاملے میں شوہر اپنی پارٹنر سے پیش رفتگی، وارفتگی اور بے پناہی کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن بیوی اپنی فطری شرم وحیا اور جھجک کے باعث پہل کرنے میں پہلو تہی کرتی ہے۔ اور اس افسانے کی ''وہ'' تو تھی ہی ایک ''ٹھنڈی چائے''۔ ہر کوئی ٹھنڈی چائے پسند نہیں کرتا۔ نوعِ انسانی کا سوادِ اعظم عام طور پر گرم چائے ہی پسند کرتا ہے۔ گرم چائے میں جو لذّت ہوتی ہے، وہ ٹھنڈی چائے میں کہاں؟

اس افسانے میں زن وشو کے مابین جو گفتگو ہوتی ہے وہ سیکس سے تعلق رکھتی ہے۔ ''سیکس'' نہ صرف ایک خوشنما لفظ ہے بلکہ لذت آمیز تصور رکھتا ہے۔ لیکن کہکشاں پروین کا کمال یہ ہے کہ زن وشو کے مابین کئی بار ہونے والی گفتگو میں کہیں بھی رکاکت اور جنسی تلذّذ کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ یہ افسانہ واجدہ تبسم کا ہوتا تو نہ جانے قاری کن جہانوں کی سیر کر رہا ہوتا۔

کہکشاں پروین بذاتِ خود ایک سنجیدہ، متین اور شائستہ خاتون ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی شریف النفسی، نیک طینتی اور نسوانی شائستگی کا اس افسانے میں بھی ثبوت فراہم کرتی ہیں بلکہ اس افسانے کی ''اس'' کی عزتِ نفس اور نسائیت کو مجروح ہونے نہیں دیتیں۔ زن وشو کے درمیان کی گفتگو میں ایک بھی غیر مہذّب، رکیک اور ناشائستہ لفظ استعمال نہیں کرتیں، لیکن پوری گفتگو واضح کر دیتی ہیں۔ یہ ایک قابلِ تحسین فن ہے۔ اس فن سے آپ بھی محظوظ ہونا چاہیں تو افسانہ ''ٹھنڈی چائے'' کا مطالعہ فرمائیں۔

میاں بیوی کے مابین ہونے والے چند مکالموں کی قرأت آپ بھی کریں اور فیصلہ کریں کہ میں اپنے دعوؤں میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

> ''وارفتگی اور بے تابیاں زندگی کا خاص حصّہ ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر یخ بستگی کا احساس ہوتا ہے۔'' [شوہر]

چند سطور آگے، جب شوہر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ اپنے وجود سے حدّت و شدّت کا ثبوت فراہم کرتی ہے، لیکن یہ حدّت و شدّت بھی شوہر کو پسند نہیں آتی تب....

> ''برف کی چھاؤں سے میں باہر نکل گئی پھر بھی تم خوش نہیں ہو۔'' [بیوی]
>
> ''رواں لہروں میں جب طغیانی بڑھ جائے تو جوار بھاٹا کے خطرے کا احساس ہونے لگتا ہے اور خوف کا یہ احساس لطف وانبساط کے تمام منظر نامے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بیوی اور طوائف میں فرق ہونا لازم ہے۔'' [شوہر]

ان مکالموں سے کماحقہٗ اندازہ ہوتا ہے دونوں کا منشا کیا ہے اور قاری پر ان مکالموں کا مفہوم اچھی طرح واضح ہے۔ لیکن مجال ہے کہ کوئی قاری کہکشاں پروین کے قلم پر انگشت نمائی کر سکے۔ دراصل اس طرح کے صاف ستھرے، رکاکت اور تلذّذ سے مبرا مکالمے مصنفہ کی برسوں کی مشاقی کا نتیجہ ہیں جن کے لیے وہ یقیناً ستائش کی مستحق ہیں۔

جہاں تک اس کہانی کے ڈکشن کا تعلق ہے تو میرا احساس ہے کہ بیانیہ کی صورت میں تحریر نکھری نکھری ہے۔ پورے افسانے میں خوبصورت، لطیف اور نفیس الفاظ نیز معنی خیز جملوں اور تراکیب کے استعمال سے حسن پیدا ہو گیا ہے۔ افسانے کے بین السطور میں معانی ومفاہیم کا ایک جہاں پنہاں ہے۔ ہر جملہ ہمیں تہذیب وشائستگی سے روبرو کراتا ہے۔

یوں تو پورے افسانے میں کئی ایک متاثر کرنے والے جملے ہیں۔ لیکن تجزیے کی طوالت کے احتمال سے میں بطور بانگی صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس کے جارحانہ سلوک کے سامنے وہ ہمیشہ کی طرح پسپا ہورہی تھی ۔مزاحمت کی راہیں بہت قبل مسدود ہوچکی تھیں۔شوریدہ جذبات حرارت کے متلاشی تھے۔بپھری ہوئی موجیں طوفان کی منتظر تھیں۔لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔لہریں تو سر اٹھارہی تھیں مگر ہلچل میں یلغار کی جگہ بلبلوں کی مدھم جلترنگ تھی۔

جو پل بھر میں کایا پلٹ دیتی تھیں دفاع کا ہر راستہ بند کردیتی تھیں۔لیکن اب یہ بند راستے اسے حواس باختہ نہیں کرتے تھے بلکہ اس راہ کے ہر نشیب و فراز کو وہ آسانی سے طے کرلیتی تھی۔ اس کی تمام توجہ اس سیڑھی پر مرکوز تھی جس کے ذریعہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں وہ بغیر رکاوٹ کے آگے بڑھ سکتی تھی۔اس کے بدلتے ہوئے ذہنی سفر میں منزل ایک نئی صورت اختیار کرچکی تھی۔خودشناسی کی دھوپ سے نکل کر وہ استحصال کے دھند میں کھونے لگی تھی کیوں کہ ان دھندلکوں میں ہی زندگی کے تار و پود کہیں پوشیدہ تھے۔کہیں مدھر مدھر سی لے اب شوریدہ سری اور بپھری ہوئی کیفیت میں تبدیل ہوچکی تھی۔

اس افسانے میں چار کرداروں کا ذکر ہے۔وہ، اس کی بہن، اس کی ماں اور اس کے شوہر ارشد کا۔لیکن اصلاً دو ہی کردار ہیں ، وہ اور ارشد۔ارشد کا کردار کچھ خاص ابھر کر سامنے نہیں آتا۔اس کی گفتگو سے بس تھوڑی بہت اس کی فطرت اور چاہت کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ ایک عام سا شوہر ہے جو بیوی سے وارفتگی چاہتا ہے جبکہ ''وہ'' ایک صابر و شاکر لڑکی ہے ۔خیالات و تصورات میں رہنے کی عادی ہے۔کتابوں اور مطالعے سے خاص شغف ہے۔اسے گھنٹوں بیٹھ کر پڑھنے کی عادت ہے جس کے سبب اکثر اس کی پیٹھ میں درد رہتا ہے۔ڈاکٹر اور ماں کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنی عادت ترک نہیں کرپاتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیٹھ کا درد دائمی ہوجاتا ہے۔گویا وہ اپنی ذات سے ایک لاپروا لڑکی ہے۔یہ اس کے کردار کا منفی پہلو ہے اور مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ ایک متین، سنجیدہ، دانش منداور تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔

اس افسانے میں مجھے ایک جملہ اور ایک لفظ کھٹک رہا ہے۔

''.....تصویر کہاں سے تم نے دیکھ لیا۔''

درست جملہ یوں ہوگا۔''.....تصویر کہاں سے تم نے دیکھ لی۔''

ممکن ہے یہ کمپوزنگ کی غلطی ہو۔

ایک جگہ مصنفہ نے لفظ ''سبزاہٹ'' کا استعمال کیا ہے جو کہ زبان دانی کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ہندی لفظ ''نرماہٹ'' کے بروزن یہ لفظ فارسی اور ہندی الفاظ کا مرکب بن گیا ہے۔ہندی میں ''اہٹ'' جوڑ کر اسمِ کیفیت بنانے کا طریقہ ہے جبکہ ''سبز'' فارسی کا لفظ ہے۔فارسی/عربی لفظ کے ساتھ ہندی لفظ/ترکیب کا الحاق درست نہیں ہے۔

بہر حال ان دو معمولی سے تسامحات کے سبب ''ٹھنڈی چائے'' کے معیاری اور دل پذیر افسانہ ہونے کی نفی نہیں کی جاسکتی۔آفرین!

○○○

Tanweer Akhtar Roomani
59, Chuna Shah Colony
P.O.: Maango
Jamshedpur-831012 (Jharkhand)
Contact No.: 7004384853
taroomani@gmail.com

ناصرین ثریا

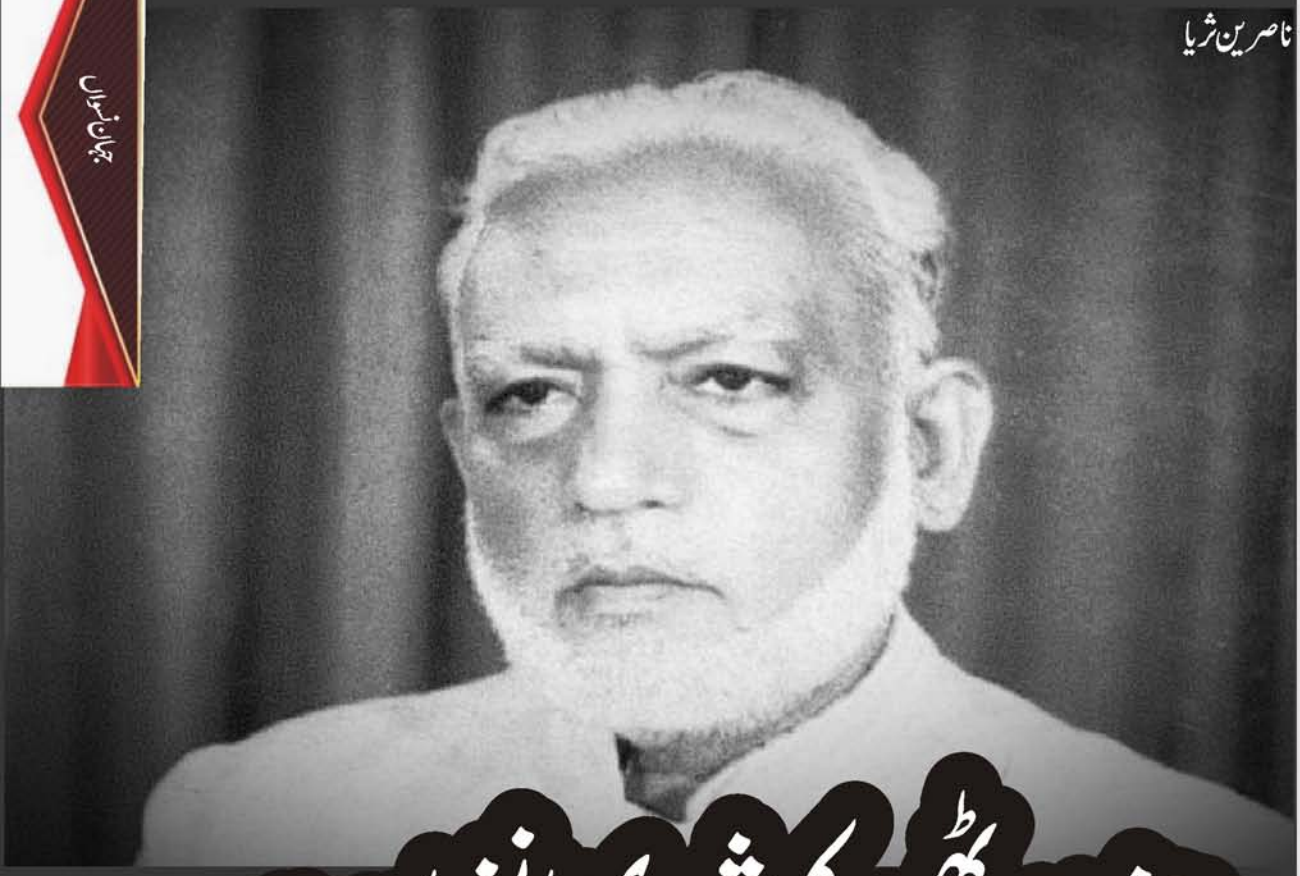

حفیظ میرٹھی کی شعری انفرادیت

اردو شاعری کی مہتم بالشان تاریخ میں حفیظ میرٹھی کا نام ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہے جسے کسی خاص نظریے، زاویے، طبقے یا ادارے کا ترجمان قرار دے کر درکنار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شاعری نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی انمٹ نقوش چھوڑے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ انھوں نے شاعری کی ایک ایسی روشن راہ ہموار کردی جس پر چل کر شعراء نئے نئے منازل طے کرسکتے ہیں۔ ان کی پوری شاعری انسانی جذبات واحساسات اور افکار ونظریات سے عبارت ہے۔ ضمیر کی آواز، خودی کی شناخت، عزت نفس کی پیروی، ظلم وجبر کے خلاف علم احتجاج اور ان جیسے موضوعات ان کی پوری شاعری میں بھرے پڑے ہیں۔ حفیظ میرٹھی نے باطل نظام کے خلاف ہر جگہ پرچم بلند کیا ہے۔ ''ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں'' کے مصداق انھوں نے اپنا احتجاج درج کرایا اور ایک ذمہ دار شہری اور حساس فنکار ہونے کا حق ادا کیا ہے۔

یوں تو حفیظ میرٹھی نے نظمیں بھی لکھیں، نعت بھی کہیں مگر اِن کی تعداد محض گنتی کی ہیں، حفیظ میرٹھی کا اصل جوہر تو غزلوں میں دکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ غالب، میر، ذوق، مومن، داغ کی طرح اردو شعر وادب کے میدان میں ایک نام حفیظ میرٹھی کا بھی ہے جنھوں نے اپنی فنی کارکردگی سے اردو غزل کو عروج کے زینے طئے کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ میں حفیظ میرٹھی کی غزل گوئی کی ابتدا اس شعر کو شامل مضمون کرکے کرنا چاہوں گی۔ ملاحظہ کیجیے:

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

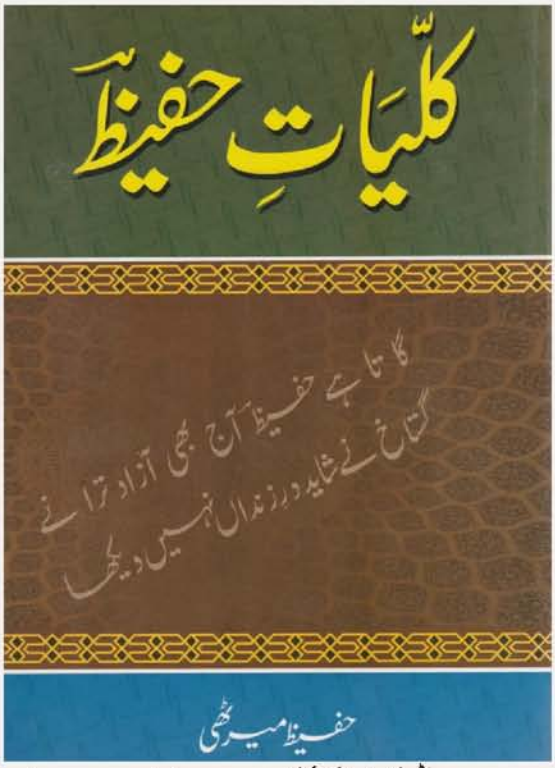

حفیظ میرٹھی کی غزل گوئی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جمالیات سے باہر نکل کر زماں اور تاریخ کو اپنی غزلوں میں سمیٹ لیا جس کی اہمیت وافادیت آج بھی برقرار ہے۔ان کی غزل اپنے حسن وفتح کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہے جس میں ایک ایسی شائستگی و شگفتگی ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ پراسراریت کا رنگ بھی جلوہ نما نظر آتا ہے۔ان کا نظریہ حیات ان کے اشعار میں خصوصی طور سے نظر آتا ہے اور مطالعہ کنندہ اسی کا گرویدہ ہوکر رہ جاتا ہے اوران کے ذہنی شعور پر لبیک کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔اس سلسلے سے حفیظ میرٹھی کا یہ کلام بالکل کارآمد نظر آتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

سوز نہ ہوتو ساز حیات
صرف اک روکھی پھیکی بات

جہاں حفیظ میرٹھی نے اپنی غزلوں میں لطیف جذبات پیش کیے وہیں ان کی غزلوں میں انقلاب کی گھن گرج بھی سنائی دیتی ہے۔ان کی شاعری میں جو انقلابی تیور ہے وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی دین ہے۔ان کے اشعار میں وہ طاقت نظرآتی ہے جس کے ذریعے وہ انگریزوں کے بڑے سے بڑے حملے کا جواب دیتے نظرآتے ہیں۔ان کے یہاں ایک اُمنگ ہے، جوش ہے ولولہ ہے، کچھ کرگزرنے کا جذبہ ہے۔نمونے کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آباد رہیں گے ویرانے شاداب رہیں گی زنجیریں
جب تک دیوانے زندہ ہیں پھولیں گی پھلیں گی زنجیریں
جب سب کے لب سل جائیں گے ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

مندرجہ بالا اشعار میں صرف ایک شاعرانہ رنگ نہیں ہے بلکہ اسی رنگ اوراسی آہنگ میں ان کی شاعری پروان چڑھتی ہوئی نظرآرہی ہے۔ مظلوموں کی حمایت اور ظالموں سے حساب وکتاب کرتے ہوئے ایسے ایسے اشعار حفیظ میرٹھی کے قلم سے نکلے جوعظمت انسانیت کے مغنی اور علم بردار بن گئے۔عام انسانوں کی مجبوری اور لاچاری پر وہ تڑپ اٹھتے تھے اور وہی تڑپ غزل کے پیکر میں جب ڈھلتی تھی تو پھراس کا سحر بہت دور تک اور بہت دیر تک قائم رہتا تھا۔

تمہارا خون بہا ہے جہاں جہاں لوگوں
مگر یہ خون نہ جائے گا رائیگاں لوگوں

ڈاکٹر تابش عبیداللہ اپنے ایک مضمون میں حفیظ میرٹھی کی تعریف میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''حفیظ میرٹھی نے اس وقت اپنی شاعری کا آغاز کیا جب ہندوستان تحریک آزادی کے آخری مرحلے میں تھا۔ ہر چہار جانب ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ گونج رہا تھا۔طوفان حوادث سے ٹکرانے کا حوصلہ اور ملک وملت کی سربلندی کا ولولہ تھا۔ ایسے میں ایک جواں سال شاعر جنہیں طوطیٔ چمن سے موانست، عندلیب گلشن سے موافقت تھی، جولیلائے آزادی کے متمنی تھے ان کے عزم جواں، سیل رواں کو کون روک سکتا تھا اوران کے جوش جنوں کا کیا کہنا۔''

حق گوئی وبے باکی حفیظ میرٹھی کا شیوہ تھا۔وہ کبھی بھی مصلحت کے شکار نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ اپنے دل اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔ ان کا ماننا تھا کہ شاعری اس طرز اظہار کا نام ہے جس میں ایک فنکار اپنے مافی الضمیر کو بقدرِ تخئیل باآسانی ادا کرسکتا ہے۔وہ ضمیر کی آواز کو دبانے کے قائل نہیں تھے۔خودغرضی اور موقع پرستی سے وہ کوسوں دور رہے۔ وہ وطن عزیز کی عزت وناموس کی محافظت کے لیے سرگرداں رہے۔تقسیم وطن کے بعد جب ملک وملت کے حالات سازگار ہوئے تو انھوں نے ان حالات کا مقابلہ مردانہ وار کیا اور لوگوں کو جہد وعمل کی ترغیب دی۔مایوس ونامراد ہوچکی قوم کو تسابلی اور سردمہری کے خول سے باہر نکلنے کے لیے میدان عمل

میں آنے کی اپیل کی۔حفیظ میرٹھی کا ماننا تھے کہ باطل کے خلاف جاری ہماری جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔اور وہ قوم جو خواب خرگوش میں ہے جب تک زندگی کے تازہ لہو کو بروئے کار نہیں لائے گی وہ مظلومیت کی دلدل سے باہر نہیں آسکتی۔قوم کو بیدار کرنے کے لیے انھوں نے انقلابی تیور ہر جگہ اختیار کیا۔لیکن ان کے انقلابی تیور ترقی پسند شاعروں کے انقلابی تیور سے قدرے مختلف ہیں۔حفیظ کے یہاں ایک میانہ روی اور اعتدال کی راہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

میدان کارزار میں آئے وہ قوم کیا
جس کا جوان آئینہ خانے میں رہ گیا
اب اہل کارواں پہ لگاتا ہے تہمتیں
وہ ہم سفر جو حیلے حوالے میں رہ گیا

حفیظ میرٹھی کے نزدیک انسانیت، احترام آدمیت ہمیشہ مقدم رہا۔ انھوں نے اپنے کلام میں انسانی زندگی کا فلسفہ پیش کیا اور لوگوں کو باور کرایا کہ زندگی کا نصب العین کیا ہونا چاہیے۔ان کا عقیدہ تھا جب تک کسی انسان کا ضمیر زندہ ہے وہ انسان زندہ ہے ورنہ وہ ایک چلتی پھرتی لاش کی مانند ہے، چاہے وہ بیش قیمتی اور زرق برق لباس ہی کیوں نہ زیب تن کرلے۔اس کا کوئی وجود باقی نہیں ہے۔رنگ و نسل، مذہب وملت اور علاقائی تعصّبات کی سبھی دیواروں کو منہدم کرنے کے لیے حفیظ ہمہ وقت سینہ سپر رہے۔وہ عزم مصمم کے پیکر تھے۔وہ تھک ہار کر بیٹھ جانے کو ایمانی کمزوری قرار دیتے تھے۔کچھ کر گزرنے کا جذبہ مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

بدی سے برسر پیکار ہیں ہم
ہدف ہے ہر جگہ باطل ہمارا
خون تھکوادیں گے اگر مرنے کی جی میں ٹھان لیں
جتنا تم سمجھے ہوئے ہو اتنا ہم بودے نہیں

حفیظ میرٹھی ایک حساس شاعر تھے۔ان کے سینے میں جو دھڑکتا ہوا دل تھا وہ انقلاب کے جذبہ سے سرشار تھا۔ وہ ملک ومعاشرے کی ناہمواری، کمزور ولاچار افراد پر ظالم سیاست کے پنجوں کو مروڑنا چاہتے ہیں۔ان کی نگاہ ان افراد کو ہر جگہ تلاش کرتی ہے جو ملک وقوم کے لیے خود کو سرمایہ ثابت کرتے ہوئے آگے بڑھیں اور ایک نظام عدل کی فضا عام کریں۔ سنہ 1975 کے ایمرجنسی کے زمانہ کو ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔اس وقت کی آمرانہ حکومت نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اپنی قوت وطاقت کو جس بے راہ روی کے ساتھ استعمال کیا اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت اچھے اچھوں میں نہیں تھی۔ان ناموافق حالات میں ان کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ سہم کر، ڈر کر یا مصلحت کی چادر تان کر ظلم کی آندھی تھمنے کا انتظار کریں۔ان کے قلم کی جنبش نے حکومت کو ملک کے عوام کو بروقت یوں للکارا:

آج کچھ ایسا طے پایا ہے حق کے اجارہ داروں میں
جو ہم پر ایمان نہ لائے چنوادو دیواروں میں
ہر ظالم سے ٹکر لی ہے سچے فنکاروں نے حفیظ
ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہہ دیں ہم ہیں تابعداروں میں

ممتاز ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری، حفیظ میرٹھی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے انقلابی رنگ پر کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''حفیظ کی شاعری میں یوں تو انقلاب کا رنگ بہت واضح اور جذباتی انداز کا نہیں ملتا، لیکن ایک آگ اور زنجیر ردیف کی غزلیں ان کے انقلابی تیور کو ایک نئے انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔وہ مظلوم کے ایسے غم خوار ہیں جو اس کے آنسو بھی پوچھتے ہیں اور اسے دلاسہ دے کر ظلم کے خلاف کھڑا کرتے ہیں۔لیکن اسے کبھی بھی ملک وقوم کے خلاف بھڑکنے نہیں دیتے۔''

(ہماری آواز: حفیظ میرٹھی نمبر، ص:51)

حفیظ میرٹھی کے اس انقلابی تیور کو اسلامی افکار ونظریات سے ان کی گہری وابستگی سے بھی جوڑا گیا۔ایسے ناقدانہ تبصرے ان کی شاعری کے ساتھ انصاف کرتے نظر نہیں آتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام میں حق و باطل کا جو تصادم ہے اور اس ضمن میں مذہب نے جو احکامات دیے ہیں حفیظ کی شاعری میں وہ تمام لوازمات بھرپور انداز میں اپنی موجودگی کا احساس کراتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی قابل ذکر ہے کہ چاہے انقلابی گفتگو ہو کہ اسلامی، انھوں نے فن کی عظمتوں کو بہر صورت قابل قدر مقام عطا کیا ہے۔یہی وہ سلیقہ ہے جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔نامور ناقد، ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالمغنی حفیظ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میں حفیظ کو ان شاعروں میں سمجھتا ہوں جن کی تربیت خواہ کسی مخصوص حلقے میں ہوئی ہو مگر اپنے حسن کلام کی بدولت وہ ادب کے دائرہ عام میں اپنے لیے ایک جگہ بنا لیتے ہیں۔میرے نزدیک یہ بات ایک شاعر کی ممکنہ عظمت کی دلیل ہے۔اس لیے کہ جب تک فکر خاص عموم فن نہ حاصل کرلے فن کے دائرے میں اس کا اعتبار نہیں قائم ہوتا۔چنانچہ یہ ایک اہم نکتہ

(''حفیظ میرٹھی مرتبہ ڈاکٹر تابش مہدی'' شخصیات سیریز 14 ،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ صفحہ201-200)

جینے ہی دے مجھے ،نہ وہ مرنے ہی دے مجھے
خنجر چلا دیا،کبھی مرہم لگا دیا
میں جو تڑپ کر رووٗں ہوں تو ظالم یہ فرمائے ہے
اتنا گہرا گھاوٗ کہاں ہے، ناحق شور مچائے ہے

میں یہ بھی عرض کردوں کہ حفیظ میرٹھی نے مقصدیت کو پیش نظر ضرور رکھا لیکن غنائیت کو بھی جانے نہیں دیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کو منفرد لب ولہجہ کا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے اور اس سلسلے سے نئی نسل بھی ان کی شعری حسیت کو تسلیم کرتی ہے۔ان کی شاعری جس طرح مختلف مسائل معاشرتی،معاشی، تہذیبی وثقافتی، تعلیمی وسیاسی منظرنامے کو سمیٹتی نظر آتی ہے۔اسی طرح طنز کی چاشنی بھی آپ کی شاعری میں جلوہ نما نظر آتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہل ظرف کے ہاتھوں میں پیالے نہیں آئے

حفیظ میرٹھی کی شاعری میں مسرت اور بصیرت کے ساتھ ساتھ ایک حوصلہ مندی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔جہاں اردو شاعری کا ایک نیا رنگ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔جو عشق کی حقیقی لذت سے بہرہ یاب ہونا چاہے اسے ہوس پرستی سے دست بردار ہونا پڑے گا یا پھر عشق ہی اسے اپنی مملکت سے خارج کردے گا:

بربادیاں بھی عشق میں بے فائدہ نہیں
اب آس پاس اہل ہوس کا پتہ نہیں

حفیظ میرٹھی نے تشبیہ واستعارہ کو استعمال کر کے بھی بہترین اشعار کہے ہیں۔جس سے ان کی فنی دسترس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس سلسلے سے یہ اشعار دیکھیے:

کہیں مسلی ہوئی کلیاں کہیں روندے ہوئے غنچے
بہت سی داستانیں ہیں شبستانوں سے وابستہ

غرض کہ حفیظ کی شاعری پر نظر ڈالئے تو باوجود یہ کہ انھوں نے غزل کے کوچے سے باہر قدم نہیں رکھا، ان کی غزل ان بہت سے اعتراضات کا مصداق نہیں بنتی جو ہمارے بزرگوں نے عام غزل پر صادر کیے۔یہ درست ہے کہ اس میں خیال بندی مسلسل نہیں ہے،لیکن یہاں محض خیالات کی ''جگالی'' نظر نہیں آتی' یہاں عشق وعاشقی کا فرسودہ تصور نظر نہیں آتا' یہاں عشق کی معاملہ بندی بھی نہیں ہے۔یہاں بندھے ٹکے روایتی مضامین بھی نہیں ہیں' یہاں تخیل کی وہ فضا بھی نہیں ہے جس کا زندگی سے کوئی ربط ہی باقی نہ رہے۔یہاں بے بنیاد خیالی مضامین بھی نہیں ہیں، یہاں درد وغم کی وہ سوزش بھی نہیں ہے کہ ہر شعر سے دھواں نکلتا معلوم ہو۔ان سب کے بجائے یہاں زندگی کے مسائل ہیں جن کے تجربے سے شاعر گزرا ہے' ان میں ارضیت ہے' زندگی کی بو باس ہے' چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھوں کے انعکاسات ہیں' یہاں اجتماعی تصورات کا عکس نظر آتا ہے' یہاں اخلاقی نکتے ہیں' خیر پر پختہ عقیدہ سے پیدا ہونے والی روشنی ہے' انسانیت کی فلاح کا تصور ہے،آرزوئیں ہیں اور مایوس ہوئے بغیر شکست آرزو کی تصویریں بھی۔کہا جاسکتا ہے کہ یہ غزل زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے لہجہ میں اجنبیت نہ ہوتے ہوئے بھی تازگی وتوانائی کا احساس ہوتا ہے۔

❐❐❐

Nasreen Surayya
Assistant Professor
Dept. of Urdu
Lalit Narayan Mithila University
Darbhanga-846004 (Bihar)
nasrin.suraiya99@gmail.com

عظمت النساء

اختر حسین رائے پوری کی تنقید نگاری

اختر حسین رائے پوری کا شمار نمایاں ترقی پسند تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی تخلیقات میں ''ادب اور انقلاب'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ''محبت اور نفرت، زندگی کا میلہ'' خودنوشت ''گرد راہ'' اور تاریخ میں ''حبش اور اطالیہ، روشن مینار'' بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو میں تراجم بھی کیے جن میں ''پیام شباب، پیاری زمین، میرا بچپن، روٹی کی تلاش اور جوانی کے دن'' وغیرہ شامل ہیں۔

1936ء میں ترقی پسند تحریک کا باضابطہ آغاز ہوا۔ اس تحریک کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا اس کو سیاسی، سماجی، تاریخی اور مادی زندگی کی روشنی میں پرکھا جانے لگا۔ ادب میں ہیئت کی جگہ موضوع کو اہمیت دی جانے لگی۔ اس نظریۂ ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ مقصدیت پر زور دینے لگے انھوں نے دبے، کچلے، غریبوں، مزدوروں، مظلوموں اور حاشیائی لوگوں پر زیادہ توجہ دی اور ادب کو زندگی کے ترجمان کی حیثیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی۔ اختر حسین رائے پوری ایسے نقاد ہیں جنھوں نے اردو ادب میں مقصدی ادب کے تصور کو واضح طور پر پیش کیا۔ ان کے خیال میں 'زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کر سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ زندگی کی روانی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے'۔ جب ان کا مضمون ''ادب اور زندگی'' شائع ہوا تو ترقی پسند نقطۂ نظر کا بنیادی مضمون تصور کیا گیا کیونکہ ترقی پسند تحریک سے قبل اختر حسین رائے پوری نے ہندی زبان میں ایک مضمون ''ساہتیہ اور کرانتی'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہی مضمون بعض تبدیلیوں کے ساتھ اردو میں ''ادب اور زندگی'' کے عنوان سے جولائی 1935 میں رسالہ 'اردو' میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے ذریعے انھوں نے اس وقت کے تاریخی تقاضوں کے پیش نظر ادب میں زندگی کے سماجی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ادب اور فن کو پرکھنے کی کوشش کی۔

اختر حسین رائے پوری اس مضمون میں علمی اعتبار سے قدیم اور عہد وسطی کے ادبی سرمائے کا جائزہ لینے کے بعد سخت تنقید کرتے ہیں اور ماضی کے اعلیٰ تخلیقی کارناموں کو قدامت پرستی کا شکار قرار دیتے ہیں۔ وہ کلاسیکی یا قدیم ادب کا جائزہ لینے کے بعد واضح کرتے ہیں کہ اس زمانے میں ادب کو صرف دو طبقے کے لوگ تخلیق کرتے تھے ایک بیراگی (صوفی) اور دوسرا امرا یا شرفا کا طبقہ۔ یہ لوگ ایسے ماحول میں رہتے تھے جو عام زندگی سے دور تھا۔ ان کی نگاہ میں نہ عام لوگوں کے مسائل تھے اور نہ ہی ان کا طرز معیشت و معاشرت، اس لیے ان کے ذریعے تخلیق کردہ ادب بھی خاص دائرے تک ہی محدود تھا۔

اختر حسین رائے پوری قدیم ادب کے تین نقائص بیان کرتے ہیں۔ مثلاً:

''(1) موضوعات ادب بہت ہی فرسودہ اور محدود تھا۔
(2) لطف بیان اور زیب داستان پر معنی و مقصد قربان کیے جاتے تھے۔
(3) ادب کو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں۔''

(ادب اور انقلاب، اختر حسین رائے پوری، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز، بمبئی 2000، ص 21-20)

ایک فن کار کس ماحول میں پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس ماحول اور ان حالات کی پوری بو باس اس کے رگ و ریشے میں موجود رہتی ہے، اسے اپنے صحت مند ماحول اور معاشرے سے بے حد محبت ہوتی ہے، اور یہی جذباتی تعلق اس کی تخلیقات میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اختر حسین رائے پوری کے نزدیک ادب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کی ترجمانی کرے۔ وہ 'ادب برائے زندگی' کے قائل ہیں۔ انھوں نے موضوع، مواد، ہیئت اور فن پر اپنے نظریات پیش کیے۔ مقصدی ادب سے اختر حسین رائے پوری کی کیا مراد ہے اور وہ کس طرح کے ادب کو پسند کرتے ہیں۔ دیکھیے:

''ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے جو اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر ترقی کے زینوں پر گامزن ہو۔۔۔ ادب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں، ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو بڑھنے نہیں دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکیں۔ کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہو سکے''

(ادب اور انقلاب، اختر حسین رائے پوری، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز، بمبئی 2000، ص 20-19)

ان کے نزدیک ایک ادیب کے فرائض یہ ہیں:

''ایک انسان اور ایک ادیب کے فرائض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا۔۔۔۔۔

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں:
(1) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے۔
(2) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں۔''

(ایضاً، ص 17-16)

اختر حسین رائے پوری نے ادب کے فنی تقاضوں یا ان کی ہیئتی ضرورتوں پر بھی بحث کی ہے ان کا کہنا ہے کہ بغیر موضوع کے ادب کی تکمیل ممکن نہیں۔ وہ ادب میں سماجی موضوع کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی محلوں، آراستہ ایوانوں، آرام دہ کرسیوں اور محفلوں میں نہیں ہوتی بلکہ زندگی تو کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے ارد گرد گھومتی ہے۔ وہ اس عہد کے پیشہ ور اور شوقیہ ادیبوں پر سخت تنقید کرتے ہیں اور ان کے اس رویے پر سر پیٹتے ہیں۔ وہ قدیم ادب کو جاگیردارانہ عہد کا زائدہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ کلاسیکی شعر و ادب میں زندگی کے مسائل اور ماحول، سماجی زندگی کی کشمکش کو جگہ نہیں دی گئی۔ پرانے زمانے میں سنسکرت میں بھی جو ادب تخلیق ہوتا رہا اس کے موضوعات کا بڑا حصہ بادشاہوں، راجاؤں اور رقص و سرود کی محفلوں میں غرق رہنے والے طبقے تک ہی محدود ہوتا تھا۔ اختر حسین سنسکرت میں تخلیق کیے گئے ایسے ادب کو نہ صرف سنسکرت بلکہ پورے بر صغیر کے قدیم ادب کا ایک سنگین المیہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک جگہ

ہندوستان کے کلاسیکی شعرا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے، ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے، پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا۔۔۔۔ ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا اور ان سب سے اہم 1857 کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا، کتنے شاعروں نے ان خوں چکاں واقعات کو نظم کیا؟ کتنے نوحے لکھے گئے؟ کہاں گئے وہ رجز گو مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک نوحہ نہ لکھا۔ واقعہ 1857 پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے۔ اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے۔ اور سوچتے تھے تو ایسے رجعت پرورانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں'' (ایضاً، ص 36)

اختر حسین رائے پوری نے کلاسیکی ادب میں موجود عمدہ اور قابل قدر عناصر کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن جن باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے وہ بے حد اہم ہیں۔ ان کے نزدیک صحیح ادب کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ انسانیت کا ترجمان ہو۔ ایک ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ زندگی کی تگ و دو میں شامل ہو کر اس کے رموز سے آگاہی حاصل کرے۔ ادیب کے بنیادی مقاصد یہ ہیں کہ وہ انسانیت، وحدت و اخوت اور مساوات کے پیغام کو عام کرے۔ اختر حسین ادب کے فرائض و مقاصد کو بیان کرنے کے بعد یہ ثابت کرتے ہیں کہ برصغیر میں جن چند ادیبوں یا شاعروں نے ادب کے صحیح اور حقیقی مقاصد کو سمجھا اور عوام کو ان کی زبوں حالی کے اسباب اور ان سے نجات کا راستہ دکھایا ان میں بنگال کے ایک انقلابی شاعر نذر الاسلام کا نام سرفہرست ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے ہی ترقی پسند نظریات کو عام کرنے کی پہلی شعوری کوشش کی۔ حالانکہ یہ اس کوشش میں بہت زیادہ کامیاب تو نہ ہو سکے، البتہ ان کی تنقیدی نگارشات کے ذریعے اردو ادب میں فکر و فن کے لیے نئے نئے مسائل بحث کے لیے پیدا ہوئے۔ گویا اختر حسین نے دانشوروں اور ادیبوں کو ایک ایسے موضوع پر سوچنا سکھایا جن پر اس سے پہلے کسی نے نہیں سوچا تھا۔ وہ اپنے نظریات کو ثابت کرنے کی مدلل کوشش کرتے ہیں۔ اس بنا پر انھیں اردو زبان میں ترقی پسند تنقید کو رواج دینے اور اردو ادب کو نئی قدروں سے روشناس کرانے والے ناقدین کی صف اول میں جگہ دیتے ہیں۔

یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ ''ادب اور زندگی'' میں موجود اختر حسین رائے پوری کے تنقیدی خیالات کی کس قدر اہمیت ہے۔ لیکن ان کے تنقیدی نظریات ان کی دیگر کتابوں میں بھی موجود ہیں، جن میں ان کے مضامین کا مجموعہ ''سنگ میل'' بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں گیارہ مضامین ہیں۔ جس میں ''ٹیگور کی ایک نظم، کالی داس کا شاہکار شکنتلا، محفل رقص کی تصویر، بے نظیر اور بدر منیر کی شادی کا جلسہ، گجرات کا باکمال شاعر اور شیر، سنسکرت ڈرامہ کا پس منظر، پریم چند کا ایک ناول، گورکی کی آپ بیتی، یورپ میں ایک ہندوستانی ادیب، اردو افسانہ نگاری میں عورت کا تصور اور سویرا شامل ہیں۔ مضامین تو سب اہم ہیں لیکن میں نے ''اردو افسانہ میں عورت کا تصور'' پر روشنی ڈالی ہے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب علم و ادب کے سرچشموں پہ صرف اور صرف مردوں کی اجارہ داری تھی۔ عورت کی شمولیت کو ادب میں معیوب سمجھا جاتا تھا، بلکہ ادب میں عورت کا ذکر بھی کسی عیب سے کم نہیں تھا۔ مگر جب عورت نے علم و ادب کے میدان میں قدم رکھا تو اس نے بڑی بے باکی، جرأت مندانہ طور پر مردوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ اس کی منافقت ہے، اس معاشرے میں کسی عورت کا عورت ہونا ایک بڑا جرم سمجھا جاتا تھا، اور اگر عورت مصنفہ یا فنکار ہے تو اس پر بغاوت کی دفعات بھی لگتی تھیں۔ جبکہ اس عہد میں عورت اور عورت کی زندگی سے متعلق ڈھیروں مسائل ایسے تھے جن پر دفتر کے دفتر سیاہ ہو جاتے۔ حالانکہ عورت نے اپنے مسائل کو ادب کے حوالے سے خاص کر شاعری کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت کے حالات اور ماحول نے اسے نمایاں نہیں ہونے دیا اور ان کی آواز شاعروں کی صف میں جگہ نہیں بنا سکی۔

''اردو افسانہ نگاری میں عورت کا تصور'' بھی اختر حسین رائے پوری کے اہم مضامین میں سے ہے۔ اس میں انھوں نے اردو ادب میں عورت کا تصور اور اس کی شمولیت کا جائزہ لیتے ہوئے قدیم ادب کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس میں انھوں نے خدیجہ مستور کے فکر و فن کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری اس مضمون میں لکھتے ہیں:

''ابھی پچھلی صدی کی بات ہے کہ اردو میں عورت کا ذکر تک معیوب تھا۔ بہت ہوا تو قصہ کہانیوں میں پریوں اور شہزادیوں

کا نام آ گیا۔ اردو شاعر بھی عورت ذات سے ایسی کنی بچاتے تھے کہ اکثر ان کے محبوب کی جنس پر شبہ ہوتا ہے۔۔۔۔ زمین پر عورت کا نقش قدم کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ بھلے گھر کی بہو بیٹیوں کا وجود تو ایک سرے سے ہمارے پرانے ادب میں ہے ہی نہیں۔ نواب مرزا شوق پہلے شاعر تھے جنھوں نے اپنی مثنوی ''زہر عشق'' میں ایک شریف زادی کے عشق کا افسانہ سنایا ہے۔ لیکن سوسائٹی نے مرحوم کو ایسا نکو بنایا کہ الاماں۔ پھر ایک مدت تک کسی شاعر کو پردہ کی آڑ میں جھانکنے کی جرأت نہ ہوئی۔''

(سنگ میل، اختر حسین رائے پوری، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ، بمبئی 1949، ص 29-128)

شاعری کے بعد جب اردو نثر کا آغاز ہوا تو عورت کا ذکر بھی ہونے لگا لیکن اختر حسین رائے پوری کے نزدیک اردو کی پرانے ناول نگاری میں بھی عورت کی شمولیت اور اس کے مسائل پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تھی پردہ۔ پردے نے مرد اور عورت کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے، پھر ان کا تجربہ اور مشاہدہ کیسے وسیع ہو سکتا تھا۔ اختر حسین رائے پوری ناولوں میں عورتوں کے ذکر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''رتن ناتھ سرشار جیسے باکمال کو دیکھئے کہ جہاں عورت کا بیان آیا اور ان کا قلم گم سم ہوا۔ بات بنائے نہیں بنتی۔ راشد الخیری پہلے مصنف تھے جنھوں نے عورت کی زبوں حالی کو محسوس کیا اور عمر بھر ان کا قلم اس بد بخت کے لیے خون کے آنسو روتا رہا۔ تاہم ان کا زاویۂ نگاہ لا محالہ مردانہ اصلاح پسندی کا ہے۔۔۔۔ اور ل تو اور پریم چند جیسا ہوش مند فن کار عورت کا سامنا ہوتے ہی بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ پہلی بار اس نے اردو ادب کے میدان میں شریف زادیوں کو بے پردہ لا کھڑا کیا۔ لیکن ان کے مطالعہ میں اس نے بھول چوک کی۔ اور تنقید کی آنکھوں سے دیکھئے تو یہ اس کے فن کا بڑا داغ ہے۔''

(ایضاً، ص 130)

راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں سماج کی دبی کچلی عورتوں اور مصیبت زدہ عورتوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو دردناک انداز میں بیان کیا۔ حالاں کہ جب اردو ناول نگاری کی روایت آگے بڑھی تو ان میں عورتوں کے مسائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا۔ جدید تعلیم کے اثرات کے سبب انسانی سماج میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کا عکس بھی ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تہذیب کا ٹکراؤ اور جدید طرز زندگی کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گھریلو حادثات و واقعات اور خاتون خانہ کی حقیقی روداد بھی ناول کا اہم حصہ رہی ہیں۔ بیسویں صدی کے اردو ادب میں عورت کا بے تکلف ذکر ہونے لگا۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں عورت کو موضوع بنایا اور اچھی بری تربیت کے عورتوں پر جو بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی عکاسی کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے طوائف کے مسائل کو بھی اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ عبد الحلیم شرر کے تاریخی ناولوں میں عورتوں کے فعال کردار ہیں، جو بہادر ہیں، جنگجو ہیں اور جو مردوں کے ساتھ جنگ کے میدانوں میں یا دیگر مہمات میں شامل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ شرر نے معاشرتی ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا۔ اختر حسین رائے پوری بیسویں صدی کے اردو ادب میں عورتوں کی شمولیت پر لکھتے ہیں کہ:

''بیسویں صدی کے اردو ادب نے عورت سے اپنے حجاب کو چھوڑا اور بے تکلف اس کا ذکر ہونے لگا۔ کوئی اسے نصیحت کے کرن پھول پہناتا تھا۔ تو کوئی مت ماری طوائف پر لعن طعن کرتا تھا۔ پھر جب یہ صدی جوان ہونے لگی تو عورتوں میں انگریزی تعلیم عام ہونے لگی۔ پردہ کی جگہ برقع نے اور برقع کی جگہ نقاب نے لے لی۔۔۔ اب شاعروں کی بن آئی۔ انھوں نے رومان کے گیت ایک نئے انداز سے الاپے اور اس رواں پسندی کا عکس نثر پر بھی پڑا۔ شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر باقی رہ گیا ہو جو کسی سچ مچ کی سلمیٰ کی یاد میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے نہ پڑا ہو۔۔۔۔۔ غرض ناولوں اور افسانوں کا مرکزی مضمون عورت کا ذکر قرار پایا۔ سوسائٹی کے مصنوعی جبر نے جو پابندیاں لگا دی تھیں وہ رنگین وادیوں اور خواب کے محلوں سے گزر کر گھروں کے در و دالان میں گھس آیا۔''

(ایضاً، ص 31-130)

مغربی خواتین تعلیم اور آزادی کا یہ مطلب سمجھتی تھیں کہ وہ بچوں اور گھر سے بیگانہ ہو کر باہر نکلیں، کلبوں میں جائیں اور پارٹیوں میں بغیر حجاب کے شرکت کریں۔ اس وقت ہندوستان کا ایک چھوٹا سا طبقہ مغربی تہذیب یعنی انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید کر رہا تھا۔ اس لیے بہت سے ناول نگاروں نے ان عورتوں کی زندگی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

بہر حال اختر حسین رائے پوری ادب میں گائے گئے رومانی گیت

کو مردوں کے کرتوت یا کارنامے گردانتے ہیں۔ان کے نزدیک ایسے ادیب اور شعرا کے لیے یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ عورت زندگی کے مسائل کو کس نگاہ سے دیکھتی ہے،عورت کی سوچ اور اس کے احساسات وجذبات سے وہ ابھی بھی محروم ہیں۔بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ''عورت کی خواہشات،محسوسات اور خیالات کا اظہار صرف اہل قلم عورتیں ہی کر سکتی تھیں'۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ایک موضوع کی حیثیت سے تو عورت نے اردو ادب میں اپنا مقام بنالیا تھا۔۔۔۔خواتین نے اپنی جنس کے نقطۂ نظر کا اظہار ادب میں شروع کیا۔اس اظہار نے افسانہ کا پیرایہ ڈھونڈا۔اور آج بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو افسانہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنی جگہ بنالی ہے۔جس بے باکی اور کھرے پن سے وہ اپنی باتیں سناتی ہیں اس کا خوگر ابھی ہمارا سماج نہیں۔'' (ایضا،ص132)

خواتین ناول نگاروں نے اس میدان میں شہسوار ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔اس سب میں خواتین پر عائد پابندیوں کے باوجود کم تعداد میں ہی سہی لیکن خواتین نے مختلف ادبی کارنامے سرانجام دیے۔احساس کمتری کے باوجود ان کے قلم سے بہترین کاوشیں وجود میں آئیں۔

چنانچہ ترقی پسند تحریک سے قبل بھی ناول میں تانیثی فکر وشعور کی بو باس کہیں نہ کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر ضرور ملتی ہے۔ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے ہی 1932 میں ''انگارے'' کی اشاعت نے اُردو ادب میں جو روشن خیالی اور حقیقت پسندی کی چنگاری پیدا کی تھی اس میں رشید جہاں کی شمولیت نے اردو ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔رشید جہاں نے ان تمام فرسودہ نظام اور جابرانہ طرز حکومت کی حد بندیوں کو توڑا اور عورت کو سمجھنے کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔عصمت چغتائی،خدیجہ مستور،ہاجرہ مسرور،صدیقہ بیگم،رضیہ سجاد ظہیر اور دیگر افسانہ نگاروں نے رشید جہاں کی فکر سے متاثر ہوکر عورت کے مسائل پر لکھنا شروع کیا۔اب یہ خواتین کسی بھی معاملے میں سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔وہ کیا سوچتی ہیں،ان کی فکر کیا ہے،ان کی خواہشات،ان کے مسائل،ان کے دکھ درد،ان کی الجھنیں وغیرہ جیسے موضوعات پر وہ قلم اٹھا رہی ہیں۔

جن خواتین فکشن نگاروں نے عورت اور ان کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل خاص طور سے جنس کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ان میں خدیجہ مستور کو ایک بلند مرتبہ حاصل ہے۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں جاگیردار گھرانے کی روایت اور ذہنیت کو پیش کیا ہے۔ان کی کہانیاں اس عہد کی مخصوص تہذیب،رسم ورواج اور سیاسی اثرات کی ترجمانی کرتی ہیں۔اختر حسین رائے پوری ان کے افسانوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان افسانوں میں ہم متوسط یا ادنی طبقہ کی عورتوں کی زندگی کے خدوخال دیکھتے ہیں۔وہ جو کچھ کہتی ہیں اس میں بڑی اصلیت ہے اور کہتے وقت وہ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتیں۔معمولی واقعات کو دل چسپ طریقہ سے بیان کرنے کا ڈھنگ انھیں خوب آتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ بعض ناظرین کو یہ کتاب ایک اسپتال معلوم ہوگی۔جس میں بیمار عورتیں اور حریص مرد جنسی الجھنوں میں گرفتار کسی سرجن کے نشتر کے حاجت مند پڑے ہوئے ہیں۔میں یہ باور کرسکتا ہوں کہ اندرون خانہ کا منظر ایسا ہی گھنؤنا ہے۔پھر کیا وجہ ہے کہ سوسائٹی ان تحریروں کو پڑھ کر چیخ اٹھتی ہے'۔۔۔۔اس قسم کی تحریریں سوسائٹی کی ایک دکھتی رگ کو چھیڑتی ہیں اور اسے یاد دلاتی ہیں کہ وہ دراصل بیمار ہے۔جس طرح مرض کے متواتر تذکرہ سے مریض چڑ چڑا ہو کر چیخنے لگتا ہے، اسی طرح یہ بیمار سوسائٹی واویلا مچانے لگتی ہے۔''

(ایضا،ص133)

اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تنقید کے بنیاد گزار نقادوں میں سے ہیں۔انھوں نے 'ادب برائے زندگی' کا نظریہ پیش کیا اور اسی نظریہ کے تحت ادب پارہ اور تخلیقات کو بھی جانچا اور پرکھا۔ترقی پسند کے دیگر بے باکانہ ادیبوں کی طرح اختر حسین رائے پوری نے بھی بڑے بے باکانہ انداز سے اپنی آواز بلند کی اور تنقیدی نظریات پیش کیے۔

□□□

Azmatunisa
C-162, 4th Floor
Thokkar No.8
Shaheen Bagh
Jamia Nagar Okhla
New Delhi-110025
E-mail: azmatunisa3@gmail.com
Mob: 9718665026

تبسم ہاشمی

پوکے مان کی دنیا

ایک سماجی وثقافتی ناول

جدید اردو ناول نگاری میں مشرف عالم ذوقی ایک اہم نام ہے۔ مشرف عالم ذوقی اردو کے ان اہم ناول نگاروں میں ہیں جنھوں نے جو کچھ لکھا بہت سوچ کر اور پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کو موضوعاتی ناول لکھنے میں مہارت حاصل تھی وہ بے باکی اور صاف گوئی سے ملک، سماج، معاشرے، تہذیب وتمدن اور انسانیت کے بنتے بگڑتے نقوش کو نہ صرف اپنی تیز آنکھوں سے دیکھتے اور مشاہدہ کرتے تھے بلکہ اس کے کرب کو دل میں اُتار لیتے تھے اور پھر ان کا قلم اپنے موضوع کے ساتھ بھرپور طریقے سے انصاف کرتا تھا۔ جہاں تک نئے موضوعات کا سوال ہے یہاں بھی مشرف عالم ذوقی دوسرے ناول نگاروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ 2004 میں ان کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' سامنے آیا اور سب کو جھنجھوڑ گیا۔ ذوقی نے نئی نسل خصوصاً 15-12 سال کے بچے، ان کی دنیا، نفسیات، جنسیت کی طرف ان کا رجحان اور ان سب کے دھماکہ خیز نتائج کو عمدگی سے زبان عطا کی ہے۔ ناول ''پوکے مان کی دنیا'' ہماری توجہ کا مرکز اس لیے بن جاتا ہے کہ اس میں نئی نسل کی دلچسپیوں اور نئے سماجی برتاؤ کی پیش کش اور طریق زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' صارفیت، میڈیا و گلوبلائزیشن، انٹرنیٹ چیٹنگ، جنک فوڈ کے اثرات کے نتیجے میں تبدیل ہوتی اخلاقیات اور روایتی اقداری سانچوں کے درمیان کشمکش کو سامنے لاتا ہے۔ ناول ہندوستان کے تناظر میں تیسری دنیا کی تہذیبی اور ثقافتی شکست وریخت اور خاص طور پر جنس کے حوالے سے بدلتے رویوں کو زیر بحث لاتا ہے۔ صارفیت، میڈیا، گلوبلائزیشن، انٹرنیٹ، چیٹنگ، جنک فوڈ کے اثرات صرف معاشی سطح پر نہیں ہیں۔ سماجی سطح پر نوجوان نسل اور کم عمر بچے بہت تیزی کے ساتھ اس منظرنامے کو نہ صرف قبول کر رہے ہیں بلکہ ان کے اثرات سے براہِ راست متاثر ہو رہے ہیں۔ کم عمر بچے اور نوجوان نسل اپنے بزرگوں کی اخلاقیات، روایات کو فرسودہ سمجھنے لگے ہیں۔ والدین کی مداخلت کو قبول نہیں کر رہے بلکہ اسے جنریشن گیپ کا نام دے رہے ہیں۔ ہم آنے والی تبدیلیوں کو قبول کرنے سے انکاری ہیں لیکن آنکھ بند کر لینے سے حقائق بدل تو نہیں جاتے بدلتے ہوئے سماجی منظرنامے میں خاندانی نظام سب سے زیادہ شکست وریخت کا شکار ہے۔

ہماری سماجی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کا تعلق ہمارے اپنے تناظر سے نہیں بلکہ عالمگیریت کے اثرات سے ہے یہ تبدیلیاں بظاہر مصنوعی اور غیر اہم نظر آتی ہیں شاید اس لیے ان پر سنجیدہ مکالمے کا آغاز نہیں ہوا لیکن یہ اتنی غیر اہم نہیں کہ انھیں نظر انداز کیا جائے۔ نوجوان حیران ہوتے ہیں کہ بزرگ انٹرنیٹ، کیبل، ٹی وی اور کلب جیسی سہولیات کے بغیر زندہ کیسے تھے؟ یعنی اب زندگی میں رشتوں، محبتوں، روایات اور اخلاقیات سے زیادہ اہمیت میڈیا اور کلب کی ہوگئی ہے۔ بات صرف جنریشن گیپ کی نہیں ہے جنریشن گیپ تو ہر دور میں، ہر نسل کا مسئلہ رہا ہے اہم بات یہ ہے کہ نئی نسل اور پرانی نسل میں یہ گیپ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اسے سمجھنا ضروری ہوگیا ہے۔ کیونکہ اسے سمجھے بغیر، سماج میں آنے والی تبدیلیوں کو سمجھنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس سارے منظرنامے کی موثر اور بھرپور عکاسی مشرف عالم ذوقی کے ناول ''پوکے مان کی دنیا'' میں کی گئی ہے۔ ناول میں ہندوستانی معاشرے کے اندر آنے والی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے اور خاص طور پر نوجوان نسل کی جنسی زندگی پر جو اثرات پڑے ہیں ان کو پیش کیا گیا ہے۔

ناول کی کہانی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کچھ بزرگ خواتین وحضرات، نئی نسل کے نمائندہ کچھ لڑکے لڑکیاں، عالمی معاشی قوتیں، بکاؤ میڈیا، مفاد پرست سیاستدان اور احمق سوسائٹی (جو عقل کا استعمال کرنا معیوب تصور کرتے ہیں) کے گرد گھومتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سنیل کمار رائے پس ماندہ علاقے گوپال گنج سے تعلق رکھتے ہیں اپنی محنت کے سہارے جج بن جاتے ہیں۔ ایک مقدمہ ان کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ ناول کے اہم کرداروں میں سنیل کمار رائے، ان کی بیوی، ان کی بیٹی ریا، ان کا بیٹا نتن اس کے علاوہ رام، شوبھا، سونالی، شالنی، روی، کنچن کے علاوہ ایک کارٹون کی طرح کیریکٹر ''پوکے مان'' کا ذکر ملتا ہے۔ سنیل کمار رائے کا بیٹا نتن اور بیٹی ریا جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد جدید تہذیب سے متاثر ہوکر ماڈرن ہوجاتے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں سنیل کمار رائے کو گوپال گنج اور دلی کے کلچر میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ انھیں اپنی سوچ وفکر اور اپنی اولاد کی سوچ وفکر میں بہت تضاد نظر آتا ہے۔ یہ تضاد انھیں اندر سے بے چین اور بے کل کیے رکھتا ہے وہ اپنی اولاد سے مختلف موضوعات پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کی بدولت خوف کا شکار ہیں۔ دونوں جنریشن ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کھانے کی ٹیبل پر گفتگو کے دوران ریا زور سے چیخ کر سنیل کمار رائے سے مخاطب ہوکر کہتی ہے۔

''یہ ہے جنریشن گیپ آپ کے اور ہمارے سچ کا ڈیڈ۔ اوٹلی جنریشن گیپ۔ آپ صرف ہماری جنریشن میں بیکٹیریا ڈھونڈو گے۔ غلط باتوں کا بیکٹیریا۔ یو آر سو کنزرویٹو اینڈ سو اولڈ فیشنڈ بدلے ہوئے زمانے میں آپ ہمیں Accept کرو گے ہی نہیں۔'' (ص:5)

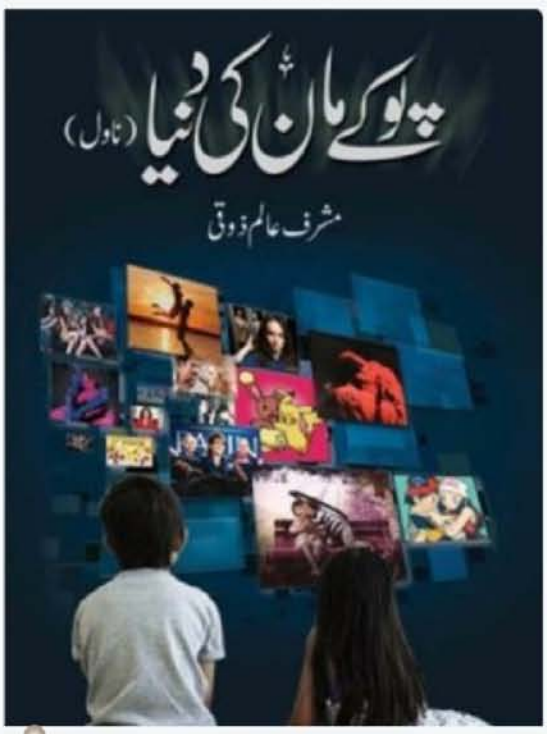

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' نئی نسل اور نئی تہذیب کی افسوسناک تصویریں پیش کرتا ہے جہاں فلم، ٹی وی، کمپیوٹر اور کارٹون، بچوں کی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں اور گلوبلائزیشن کے خوبصورت نام پر ایک نئی صارفیت زدہ، ہوس کی اجارہ داری کرنے والی تہذیب پیدا ہو رہی ہے۔ یہ ناول ذوقی کے مشاہدے کی گہرائی کا اچھا نمونہ ہے اور ثابت کرتا ہے کہ یہ ایماندار فنکار ہماری زندگی اور تہذیب کو متاثر کرنے والے ہر چھوٹے بڑے واقعے اور حادثے کو بہت شدت سے محسوس کرتے تھے اور جیسے محسوس کرتے تھے اسی سچائی سے بیان کر دیتے تھے۔ آج کے والدین کے پاس وقت نہیں ہے وہ دفتر کاروبار اور دیگر امور میں اس قدر مصروف ہیں کہ انھیں پتہ نہیں کہ ان کے بچے کیا کر رہے ہیں۔ اور ان کی زندگی کون سا رُخ اختیار کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سائبر عہد کے بچے نہ صرف عمر سے پہلے جوان ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے سائنٹس بچوں کو کرائم کی طرف اُکساتے ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار سنیل کمار رائے کے پاس ایسا ہی ایک کیس آتا ہے۔ بارہ سال کا روی کنچن اور اس کی ہم عمر اور ہم جماعت سونالی اپنے گھر میں فحش فلم دیکھتے ہیں اور پھر اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ سونالی کا باپ جے چنگی دلت ہے اس کی سیاسی جماعت اسے مشورہ دیتی ہے کہ اس کا فائدہ اٹھایا جائے جے چنگی اپنے کیریئر کے لیے اس پر عمل کرتا ہے اور گھر میں اختلافات جنم لیتے ہیں۔ جج سنیل کمار پر سیاسی جماعت کی طرف سے دباؤ ہے کہ بچے کو زنا بالجبر کا مجرم قرار دے کر اسے سخت سزا دیں۔ سنیل کمار معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بچے سے ملاقات کرتے ہیں اور حقیقت جاننے کے بعد بچے کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے مقدمے کا فیصلہ سناتے وقت اصل مجرم اس بدلتی تہذیب، نئی ٹیکنالوجی کو قرار دیتے ہیں جو بچوں کے چہرے بدلنے پر تلی ہوئی ہے۔

> ''میں پورے ہوش وحواس میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیراتِ ہند دفعہ 302 کے تحت میں اس نئی ٹیکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائزیشن کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں۔ ہینگ ٹو ڈیتھ۔'' (ص:173)

''پوکے مان کی دنیا'' ایک حقیقت حال کا بیانیہ ہے زندگی ایک مسلسل کشمکش ہے اور اس ناول کے کردار انھیں حالات اور اسی کشمکش سے ہر جگہ جوجھتے رہتے ہیں۔ ناول دراصل بچوں کی ابتدائی دلچسپی کو لے کر آگے بڑھتا ہے کس طرح بچے سوسائٹی میں اپنی غیر ذمے دارانہ دلچسپیوں کے ساتھ قتل وغارت گری، جوا، شراب، ریپ اور دوسرے جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں اور سماجی زندگی کو کہاں پہنچا دیتے ہیں اس کی دلچسپ مثالیں اس ناول میں موجود ہیں۔ یہ ارتقا ہے یا انسان کا تہذیبی زوال؟ یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے جس کا جواب ناول نگار نے خود نہ دے کر قارئین پر بہت کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول ایک طرح سے اردو کے لیے نئے ناول کا Landmark بن جاتا ہے۔

> ''اب یہ کھیل وہ گھر کے کسی بھی گوشے کونے میں کھیل سکتے ہیں اور اس کے لیے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ پابندی اس لیے نہیں ہے کہ ماں باپ کو اپنے بچوں کی فکر ہی نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔''

(ص:275)

یہ آج کے ناول کی وہ نئی دنیا ہے جو منٹو اور عصمت چغتائی سے میلوں آگے چلی آئی ہے۔ غلط ہے یا صحیح ہے اس کا فیصلہ خود آج کی نئی نسل ہی کرے گی کہ جب زندگی میں چاروں طرف یہی فضا ہے تو اسے قبولیت حاصل ہو کر رہے گی۔ یہ کرائسس ہے یا آج کی مادی اور صارفیت کی دنیا کا اگلا قدم ہے، اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ آج جب کہ دنیا ایک عالمی گاؤں بنتی جا رہی ہے تو ایک کونے میں گاؤں کے جو ہو رہا ہے، دوسرا کونہ اس سے کیسے بچ سکے گا اُسے کون بچائے گا؟

کتابیات

نمبر شمار	کتب	مصنف	ناشر	سنِ اشاعت
1۔	اردو ناول آزادی کے بعد	ڈاکٹر اسلم آزاد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2020
2۔	اُردو کے ناول کے اسالیب	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	2006
3۔	پوکے مان کی دنیا (ناول)	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004

□□□

Tabassum Hashmi
1806, Ahmad Manzil
Kalan Mahal
Daryaganj
New Delhi-110002
Mob: 9667494982
tabassumtabassum4265@gmail.com

اسنٰی سحر

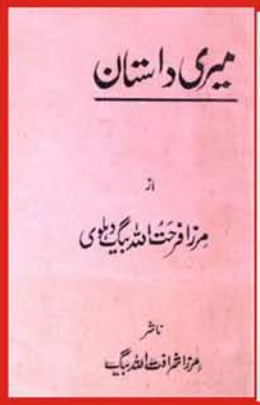

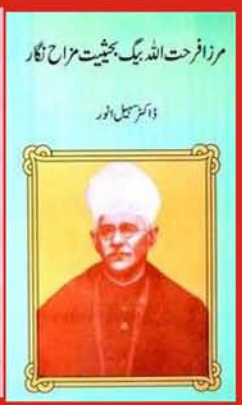

مضامین فرحت

موضوعات کا قوس وقزح

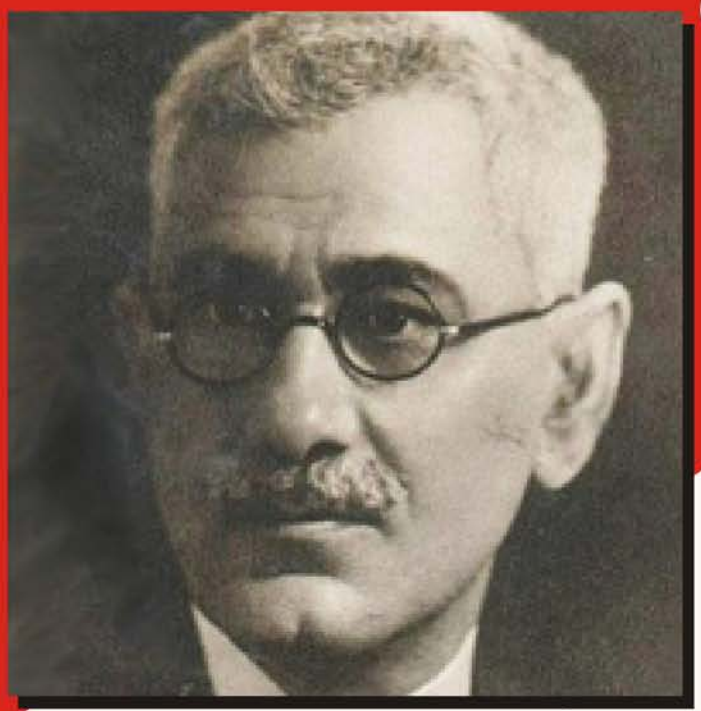

بیسویں صدی اردو ادب کے ترویج و اشاعت میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔اس صدی نے اردو کو ایسے جلیل القدر دانشوران ادب عطا کیے جس کی مثال گزشتہ صدیوں کے مقابلے منفرد ہے۔اس صدی کی ابتدا میں ہندوستان انگریزوں کے زیر سایہ سانسیں لے رہا تھا، آزادی کا شور کم ہو گیا تھا، پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اس کے بعد ایک دفعہ پھر آزادی کی امید دل میں اٹھنے لگی تھی اور آزادی حاصل کرنے کا بگل پھر بج اٹھا، شدید خوں ریزی ہوئی، آزادی نصیب ہوئی اور آخر کار آزادی کے ترانے گائے گئے۔ایسی گہما گہمی و پر انتشار ماحول نے ہی ہمیں میر محفوظ علی، رشید احمد صدیقی، میر ناصر علی، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور جیسے درنایاب اور باکمال طنز و مزاح نگار عطا کیے جنھوں نے اپنے نادر فن کے ذریعہ زمانے کی ناہمواریوں اور دشواریوں سے آزاد کر کے لطف و انبساط کا سماں باندھا اور اسی صدی کا ایک نایاب تحفہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی صورت میں حاصل ہوا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش ستمبر 1885 میں دہلی میں مرزا حشمت اللہ بیگ کے گھر میں ہوئی۔زمانہ دستور کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم گھر اور مدرسہ میں ہوئی۔بعد میں اسکولی تعلیم کا سلسلہ ہندو کالج سے شروع ہوا۔یہاں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے سینٹ اسٹیفنز کالج سے بی۔اے مکمل کیا۔انھوں نے ایم۔اے میں بھی داخلہ لیا لیکن گھر کے معاشی حالات درست نہ ہونے کی وجہ سے تلاش معاش میں مصروف ہو گئے۔سب سے پہلے حیدر آباد کے ایک گورنمنٹ اسکول میں بطور اسسٹنٹ ٹیچر کے ملازمت حاصل ہوئی لیکن اس عہدہ پر زیادہ عرصہ ان کا دل نہ لگا اور ہائی کورٹ میں بحیثیت مترجم تقرر ہوا۔اس کے بعد انھوں نے اپنی اعلیٰ ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے جوڈیشنل امتحان پاس کیا۔اس شعبہ میں وہ دن بہ دن ترقی کرتے رہے اور آخر کار وہ ہائی کورٹ میں اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہو گئے اور اس طرح فرحت اللہ بیگ گلبرگہ ہائی

کورٹ کے سیشن جج بھی رہے اور بالآخر انسپکٹنگ آفیسر کے عہدہ سے 1942 میں سبکدوش ہوئے اور چند سال بعد 27/اپریل 1947 میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش اس زمانے میں ہوئی جب ہندوستان میں مغربیت حاوی ہو چکی تھی اور مشرقیت ختم ہو رہی تھی۔ 1857 کی بغاوت رونما ہو چکی تھی اس کا ایک مخلوط تہذیبی ماحول تیار ہو گیا تھا جس کے زیر سایہ مرزا صاحب کی پیدائش ہوئی اور بعد از پرورش بھی اور مرزا صاحب نے دہلی کے مشرقی و مغربی تہذیب کی مشترکہ خوشبو میں بسی ہوئی فضا میں سانس لینی شروع کر دی۔ مرزا صاحب نے اپنی مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز رسالہ ''نمائش'' میں ایک مزاحیہ مضمون بعنوان ''ایک نواب صاحب کی ڈائری'' سے کیا۔ حالانکہ اس سے قبل ان کا مضمون ''ہم اور ہمارا امتحان'' کے نام سے رسالہ ''افادہ'' میں شائع ہو چکا تھا لیکن انھوں نے یہ مضمون کسی اور نام سے چھپوایا تھا۔

مرزا صاحب کے باقاعدہ مضامین کا مجموعہ ''مضامین فرحت'' کی شکل میں قارئین کے سامنے آیا لیکن اس کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ مضامینِ فرحت سات جلدوں پر مشتمل ہے جس سے مرزا صاحب کے بیک وقت مزاح نگار، خاکہ نگار، محقق، مورخ، مصور ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی، اصلاحی، تحقیقی و تنقیدی، تاریخی، جاسوسی، مزاحیہ موضوعات کی کارفرمائی ملتی ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں وہاں وہ خامہ فرسائی کا پورا پورا حق ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت اگر کسی بھی فنکار کی تخلیقی صلاحیت میں موضوعات کا تنوع یا رنگا رنگی موجود ہے تو وہ اس کے عمیق مشاہدے اور وسیع تجربات کی دلیل ہے۔ مرزا صاحب کا یہ خاصہ ہے کہ وہ موضوعات میں نفیس رنگوں کا انتخاب کر کے مضامین کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ ان کے مضامین کی تمام جلدوں میں زیادہ تر اصلاحی اور مزاحیہ نوعیت کے مضمون حاوی ہیں۔ لیکن ان میں یہ بات بھی پنہاں ہے کہ وہ جب بھی اصلاحی انداز کے مضامین تصنیف کرتے ہیں تو شگفتگی کا عنصر اس قدر نمایاں ہوتا ہے کہ وہ ایک خوبصورت انشائیہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پہلے اصلاحی موضوعات سے متعلق مضامین کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے لیکن اسے بھی ہم دو قسم کے مضامین کے زمرے میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے وہ اصلاحی مضامین جو روزمرہ زندگی میں مختلف مسائل یا معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے اصلاحی مضامین جن کا براہ راست تعلق مسائل خواتین سے ہے۔

''ہم اور ہمارا امتحان'' مضامین فرحت حصہ اول میں شامل مضمون ہے جو انسانی ہمدردی کے جذبات سے ممیّز ہے۔ وہ یہاں دو رخ کا ذکر کرتے ہوئے امتحان دینے والے اور امتحان لینے والے کے جذبات و احساسات کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر پرکھتے ہیں۔ مضمون کے ایک رخ میں جہاں امتحان کے لیے رئیس امیدوار کی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ دکھایا گیا ہے وہیں دوسرے رخ میں امتحان لینے والے کے دل میں ایک محنتی مگر مفلس امیدوار کے لیے ہمدردی اور مخلصانہ رویہ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہاں مضمون نگار اس بات کی پوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ انسان کو انسانیت کے اعلیٰ معیار پر لے جایا جا سکے اور اس کو وہ تمام خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے تاکہ اسے حقیقتاً اشرف المخلوقات ہونے کا شرف مل سکے۔ مضمون میں ایک جگہ پر درج ہے:

> ''یہ اپنے تمام واقعات بے کم و کاست چھپوا دیں۔ تاکہ ہم لوگوں کو جو روپے کو بے دریغ لٹا رہے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اکثر بھائی، بہنیں کس مصیبت میں ہیں اور کس طرح غربت بسا اوقات ہمارے جواہر پاروں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور کس طرح ہم لوگ اپنی ہمدردی کے فرض کو بھول کر روپے کو بے غل و غش واہیات اور خرافات میں تباہ کر رہے ہیں۔''

(مرزا فرحت اللہ بیگ، مضامینِ فرحت حصۂ اوّل، ص 102)

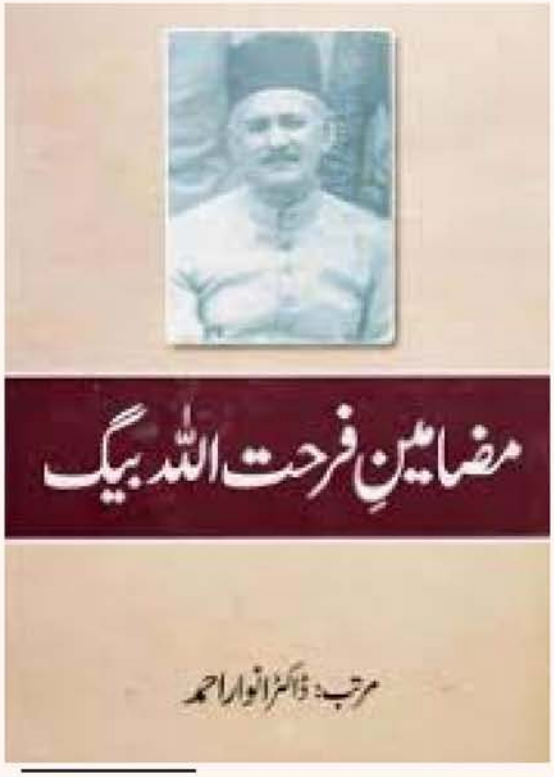

دوسرا مضمون ''مردہ بدست زندہ'' ہے جہاں مرزا صاحب میت کی تجہیز و تکفین کو موضوع بنا کر اس کے صحیح آداب و اطوار سے ہمیں باور کراتے ہیں جس میں عموماً کچھ نہ کچھ غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں جنازہ میں شامل ہونے والوں سے لے کر گورکن کے مزاج اور قبرستان کے ماحول کو بھی بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ قبروں کی کس طرح بے حرمتی ہوتی رہتی ہے۔ اس مضمون میں مرزا صاحب نے چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعہ ہر شخص سے سرزد ہونے والی کوتاہیوں کو طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں۔ اُن کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے۔ اور ہر قبر کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور اُن کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لیے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔''

(مرزا فرحت اللہ بیگ، مضامین فرحت حصہ دوم، ص57)

اس قسم کا تیسرا مضمون ''اونھ'' ہے جو انسان کی زبان سے ادا ہونے والا بظاہر ایک معمولی سا لفظ ہے لیکن ہندوستانی عوام کی فطرت میں اس طرح دخیل ہے کہ اس کی وجہ سے ہر انسان خواہ گھر کا کوئی بھی فرد ہو، رشتہ دار ہو، پڑوسی ہو، لیڈر ہو یا پھر کوئی بھی ادنیٰ و اعلیٰ انسان، ہر مقام پر اونھ کی وجہ سے عجیب و غریب صورت حال رونما ہوتی ہے۔۔ یہاں انھوں نے دور قدیم سے دور جدید تک کا سفر کر کے اونھ کی مختلف کیفیات اور اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے دور سلطنت میں بادشاہوں، سیاسی لیڈروں، طالب علموں، بیوی و شوہر کی اونھ لفظ کے استعمال کی صورتحال کا ذکر نہایت ہی پر لطف طریقے سے کیا ہے۔ تاہم آخر میں مرزا صاحب اونھ کے سلسلے میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں:

''ہم نے اس تقدیر کو ان تین درجوں پر لے جا کر صبر، رضا اور تسلیم تک پہنچایا۔ لیکن اس سے بھی جب ہماری سیری نہیں ہوئی تو چوتھا درجہ ''اونہہ'' کا نکالا۔ تقدیر خالص کا یہی آخری زینہ ہے جہاں اتنا بھی خیال آنا کہ ہم نے اس معاملہ میں تسلیم سے کام لیا ہے۔ گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ ہماری ہمتوں کی تعریف کرنی چاہیے کہ ہم اس آخری زینہ کو بھی طے کر چکے ہیں اور اگر زمانہ کی یہی حالت رہی تو تھوڑے ہی دنوں میں اس ''اونہہ'' سے بھی کوئی اونچا مقام نکال کر وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے اور انشاءاللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔''

(مرزا فرحت اللہ بیگ مضامین فرحت حصہ سوم، ص87)

ظاہر ہے مرزا صاحب نے اونھ کو اہمیت دیتے ہوئے اس سے باز رہنے کی تلقین کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ یہ بے پروائی یا بے اعتنائی کی مختلف مفاہیم اور صورتوں کی طرح نازل ہوتا ہے جو کہ انسانی اخلاق میں بدانتظامی کو دعوت دیتا ہے۔

''بے تکلفی'' ایک ایسا اصلاحی مضمون ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بے تکلفی ضرورت سے زیادہ ہو تو نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں مرزا صاحب مزاحیہ نکتے کو پیش نظر رکھ کر انسانی رویوں میں اصلاح کے حامی نظر آتے ہیں۔ وہ بے تکلف ہونے کے لیے منع نہیں کرتے بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ رشتہ خواہ کوئی بھی ہو تکلف کے دامن کا ہمیشہ خیال رکھنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے ورنہ بے تکلف گفتگو سے ہم کئی مشکلوں و دشواریوں میں پڑ سکتے ہیں۔

ان کا ایک اصلاحی مضمون ''غلام'' ہے جہاں وہ ایک غریب لڑکے کے ذریعہ انسان کی خصلت اور اس کے رویوں کی کہانی سناتے ہیں۔ اس مضمون میں ہلکا پھلکا مزاح کرتے ہوئے مرزا صاحب نے ان رئیس لوگوں پر طنز کیا ہے جو غریب کو غلیظ سمجھ کر اس کے ساتھ انتہائی بدترین سلوک اختیار کرتے ہیں جو انسانیت کے سطحی معیار کی نشانی کو عیاں کرتا ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ انھوں نے انسانی رویوں میں اصلاح کی کوشش کی ہے۔ مضمون ''کہانی'' میں مرزا صاحب تمثیلی انداز میں شکر و صبر سے زندگی بسر کرنے میں ہی عافیت اور بہتری سمجھتے ہیں اور اس کے ذریعہ ہی انسانی زندگی کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک دلچسپ مضمون ''صاحب بہادر'' ہے جس میں انگریزوں کے عادات و اطوار کو اپنانے کی غرض سے ایک شخص بغیر غور و فکر کرے نقل پر نقل کرتا چلا جاتا ہے جبکہ اس کو ہندوستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے تاہم وہ خوامخواہ میں وہ تمام حرکتیں کرتا ہے جو ایک عقل مند شخص کو زیب نہیں دیتی۔ اس کی نظر میں ہندوستانی تہذیب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یعنی یہاں بھی انسانی عادات میں اصلاح کے موضوع کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان تمام مضامین کے علاوہ ''میاں وحشت''، ''انجمن اصلاح حال بد معاشیاں''، ''شرابی''، ''ثالث بالشر''، ''دیار عشق''، ''کیا میں ڈرپوک ہوں'' وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں جہاں انسان اور زندگی کے مختلف النوع مسائل کو انتہائی عمدگی کے ساتھ ادبیاتِ مزاح میں پرویا گیا ہے۔

دوسرے قسم کے اصلاحی مضامین میں پہلا دلچسپ مضمون

''بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر'' ہے جس میں ازدواجی زندگی میں میاں اور بیوی کی ضد کا نقشہ بڑے مزاحیہ انداز میں کھینچا ہے۔ یہاں وہ یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شادی کے کچھ سالوں بعد چھوٹی چھوٹی باتوں پر میاں اور بیوی کے درمیان اختلاف ہونے لگتے ہیں اور اسی صورت حال کے پیش نظر ایک دفعہ جب ان کا بچہ جو انفلوئنزا کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور صحیح نگرانی نہ ہونے کے سبب انتقال کر جاتا ہے تب آخر میں دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی میاں اور بیوی کے آپسی جھگڑے کے سبب ایک معصوم بچہ اپنی جان کی قیمت ادا کرتا ہے۔ اس مضمون میں مرزا صاحب نے شوہر اور بیوی کے درمیانی تعلقات کو مضبوط کرنے، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کی قدر کرنے، آپسی ضروریات کا خیال رکھنے، محبت و احترام کرنے اور ایثار و قربانی جیسے جذبے کے اصلاح کی پرزور کوشش کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''تھوڑے دنوں خاصی طرح گزری۔ مگر میاں کو یاروں کی صحبت کا چسکا پڑ گیا تھا۔ گھر میں ہر وقت پڑا رہنا موقوف ہوا۔ بچوں کی چیاؤں پیاؤں سے دل گھبرانے لگا۔ کبھی یاران کے گھر۔ کبھی یہ یاروں کے گھر۔ آخر ایک دن شروع ہو ہی گئی۔ ''رات کو بھی کیوں آتے ہو۔ جہاں دن کو رہتے ہو رات کو بھی وہیں رہا کرو۔ یہ گھر اب تھوڑی رہا ہے۔ سرائے ہو گیا ہے۔ بیوی بچاری سے تو واسطہ ہی کیا ہے۔ بچوں کو بھی چھوڑ بیٹھو۔'' بھلا ایک کمانے والے پر یہ اعتراض ہوں اور وہ چپ رہے۔ انھوں نے بھی دل کا بخار نکالا۔ ''آخر تمھارے پاس بیٹھ کر بچے کھلایا کروں یا آپ کی صاحبزادی کو جھولا جھلایا کروں۔ تم کو بچوں سے فرصت کب ہے جو میرا خیال کرو اور خیال کرو تو تم جیسوں کے ساتھ کیا خاک دل بہلے۔''

(مرزا فرحت اللہ بیگ، مضامین فرحت حصہ دوم، ص52)

ان کا دوسرا مضمون جو عورت کے کردار و نفسیات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ ہے ''مولوی صاحب کی بیوی''۔ یہاں مرزا صاحب نے سلیقہ شعار اور نیک کردار خواتین کی طرف اپنی قلم کی جولانی بکھیری ہے۔ ان کے خیالات کی رو سے اگر عورت یا بیوی با کردار و باشعور ہو تو بد سے بدتر انسان بھی نیک و صالح بن سکتا ہے۔ یہاں مرزا صاحب نے ایک عورت کا کردار زندگی میں کس قدر اہمیت کا درجہ رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ کیسے کسی مرد کی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے، یہ بتانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس مضمون میں افتخار نامی ایک نوجوان ہے جو خراب صحبت کے باعث والدین کے دولت کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ اس کی بیوی ایک مولوی کی بیٹی عفت آرا جس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے وہ اپنے شوہر کو ان بری صحبتوں سے دور کر کے اس ایک شریف النفس انسان بنا دے اور بالآخر ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ ایسا نسوانی کردار ہے جو محنت و مشقت کی کمائی کو بچانے کے لیے اور اس کی اصل قدر و قیمت سمجھانے کے لیے کوشاں ہے۔ مضمون نہایت شگفتہ اور سیدھے سادے انداز میں ایک ناصح کا کردار ادا کرتا ہے جس سے معاشرتی نظام میں پھیلی بدانتظامی کو درست کیا جا سکے۔ چونکہ وہ ایک حساس دل کے مالک تھے یہی وجہ ہے کہ وہ روایات و اقدار کو نیست و نابود ہونے سے شدید نالاں تھے اور اس کا برملا اظہار بھی مضامین میں کیا ہے۔

خواتین کے مسائل کو پیش کرتا ہوا ایک مضمون ''کم سنی کی شادی'' ہے جس میں کم عمر بچیوں کی شادی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ قدیم ہندوستان میں یہ مسئلہ ایک عرصہ تک دراز رہا جس کی بنا پر بیشتر اوقات طرح طرح کے نقصانات سے ہمارے معاشرے کے لوگوں کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مضمون میں ایک کردار اپنے بھائی اور بھابھی کو اپنی بیٹی کی کم سنی کی شادی سے منع کرنے کی صلاح دیتے ہیں اور بعد میں لڑکے والوں کی طرف جا کر ان کے والد کو بھی اس کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہیں لیکن کوئی بھی ان کی بات کو نہیں سنتا بلآخر ایک بچی دق کی بیماری کا شکار ہو جاتی ہے اور دوسرے حمل میں جاں بحق ہو جاتی ہے۔ مضمون کی آخری چند سطریں:

''مگر مجھے امید نہیں کہ میری ہندوستانی بہنیں اس سے سبق حاصل کریں گی۔ کیونکہ بچوں کی شادی کا وہ شوق ہوتا ہے کہ ان کو اس وقت بھلا برا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ کم عمری میں شادی کر دیتی ہیں اور آخر میں پچھتاتی ہیں۔''۵

(مرزا فرحت اللہ بیگ، مضامین فرحت حصہ پنجم، ص200)

اس سلسلے کا ایک مضمون ''بیوی کی انا'' ہے جس میں جاگیردارانہ نظام کی روایت کو پیش کیا گیا ہے جہاں شادی کے وقت دلہن کے ساتھ ایک نوکرانی بھی روانہ کی جاتی تھی تاکہ سسرال میں بیٹی کی گھریلو کاموں وغیرہ میں مدد ہو سکے۔ یہ نوکرانیاں گھر کے دیگر کاموں میں تیز ہونے کے ساتھ زبان کی بھی تیز ہوتی تھیں۔ کسی کو بھی بے وقوف بنانا، مختصر عرصے میں مالکوں کا اعتماد حاصل کر لینا، کسی کو بھی باتوں میں زیر کرنا، دوسرے کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا اور اہل خانہ کے اندرونی معاملات میں جا بے جا دخل اندازی اور گھر کے مال و اسباب پر نظر رکھنا اور ان کو کسی حیلے بہانے سے اپنے گھر یا کسی عزیز کے یہاں بھیجنا ان کے خاص جوہر ہوتے ہیں۔ مضمون کی انا کا انداز دیکھیے:

''اگر میں نے میاں زاہد کے کپڑے ان کی الماری سے نکال کر صندوق میں رکھ لیے تو کیا یہ چوری ہوئی۔ انھوں نے مجھے گھر سنبھالنے کو کہا تھا۔ میں نے یہ مال وہاں نہیں رکھا، یہاں رکھ لیا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں۔ اتا جی تمھارا یہ کہنا صحیح ہے۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ میاں زاہد کی بیوی کا سارا جہیز کہاں گیا۔ وہ تو نہ کسی الماری میں ہے اور نہ تمھارے کسی صندوق میں۔۔۔۔ کہنے لگیں۔'' واہ میاں واہ۔ یہ بھی آپ کا عجب انصاف ہے۔ جہیز کا سارا سامان تو وہ بیچاری مرنے والی میری نواسی کو دے گئی تھی۔''

(مرزا فرحت اللہ بیگ، مضامین فرحت حصہ ہفتم، ص58)

یہ تمام خصوصیات اس قسم کی خواتین میں موجود ہوتی ہیں اور مرزا صاحب نے ان کی ہی اصلاح کا اشارہ دیتے ہوئے معاشرتی نظام میں اعتدال وتوازن کے لانے کے خواہاں ہیں۔

مرزا صاحب کا ایک اور مضمون ''مولوی صاحب کی بیوی'' کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے ایک بے بس عورت کی تصویر کشی انتہائی سادگی سے کی ہے۔ یہاں ایک مشرقی تہذیب واقدار کی پروردہ خاتون کا کردار اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ جہاں وہ ایک طرف اپنے شوہر کی فرمانبردار بیوی ہے تو وہیں دوسری طرف اولاد کی محبت میں گرفتار خاتون۔ نصف مضمون میں وہ شوہر کی تابعدار بیوی رہتی ہے لیکن ایک بیماری کا انکشاف ہوتے ہی اس کی بے بسی ولاچاری دور ہوجاتی ہے اور وہ اپنے حقوق کا استعمال کرتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کی مدد سے قانونی کاروائی کر کے اپنی عزت کو مجروح ہونے سے بچالیتی ہے۔ زندگی میں مرد حضرات اپنی ناکامی وکوتاہیوں کی تہمت بسا اوقات بیوی اور بچوں پر مظالم ڈھا کر نکالتے ہیں۔ اس میں اصلاح کی اشد ضرورت کو مرزا صاحب نے اولیت دی ہے۔ ظاہر ہے مرزا صاحب نے اپنے ہر مضمون میں خواتین کے مسائل کو ہمدردانہ زاویے سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ وہ جب بھی عورت کا کردار پیش کرتے ہیں تو ان کے یہاں عورت کی زبوں حالی کی صورت نہایت ہمدردی اور دردمندی کے جذبات کے ساتھ ملتی ہے۔

مرزا کے یہاں موضوعات کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر ہم ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے سلسلے میں تحقیق کریں تو یہ ایک نئے زاویۂ نگاہ اور روشن خیال دماغ کا پرتو معلوم ہوتے ہیں۔ مضامین فرحت میں ''خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان''، ''حافظ عبدالرحمٰن خان احسان''، ''حکیم آغا جان عیش''، ''نظیر اکبر آبادی'' جیسے تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ بھی مرزا صاحب نے دیگر مضامین مثلاً داغ، دیوان یقین، انشاء اللہ خاں انشا وغیرہ پر بھی تحریر کیے جو ان کے ادبی ذوق کے عین مطابق ہے۔ ان کے تمام تحقیقی مضامین میں تحقیق کے اصولوں وضوابط کو بہ خوبی استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں موضوع کی مناسبت سے تمام پہلوؤں پر تحقیقی وتنقیدی نظر رکھی ہے جو ان کی اعلیٰ ذہانت کی نشاندہی کرتی ہے۔

مضمون ''حکیم آغا جان عیش دہلوی'' مضامین فرحت (جلد دوم) میں شامل چھیاسی صفحات پر مشتمل مضمون ہے لیکن اس سے قبل یہ مضمون انجمن ترقی اردو ہند کے سہ ماہی رسالہ ''اردو'' میں اکتوبر 1948 کے شمارے میں شائع ہوا۔ چونکہ اردو ادب میں حکیم آغا جان عیش کا نام گمنامی کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا مرزا صاحب نے اپنی تحقیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر عیش کی ادبی وتخلیقی ہنرمندی پر ایک محقق کی طرح تبصرہ کیا ہے لیکن چونکہ مرزا صاحب کی طبیعت میں مزاحیہ عنصر پوشیدہ ہے اس لیے وہ اس سے باز نہ آسکے اور اکثر مقام پر وہ طنزیہ ومزاحیہ بیان کا سہارا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ انداز دیکھیے:

''لیجیے یہ ہیں حکیم آغا جان عیش دہلوی اور یہ ہے ان کا کلام۔ اچھے برے کا اندازہ آپ کر لیجیے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ زبان اردو پر ان کا بڑا احسان ہے۔''

(مرزا فرحت اللہ بیگ، مضامین فرحت حصہ دوم، ص231)

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تحقیق کے آداب سے واقف نہیں یا اس کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں بلکہ مزاحیہ پیرائے میں وہ تحقیقی کام انجام دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کا یہ تحقیقی مضمون عیش کے ادبی کارناموں کا ہی احاطہ نہیں کرتا بلکہ ان کے خاندان، عادات واطوار، حلیہ ونین ونقش وغیرہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے اس کے ساتھ ان کی شعری کائنات کو بھی سپرد قلم کیا ہے جس میں مرزا صاحب کی کاوش صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ مرزا صاحب کا یہ عمدہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک فراموش شاعر کو اردو دنیا میں ایک دفعہ پھر سے زندہ کرنے کی پہلی بار کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان کے کلام کے اچھے نمونے نہ صرف پیش کیے بلکہ ان پر تبصرہ وتشریح کا بھی حق ادا کیا جو ان کے ماہر محقق ہونے کی دلیل ہے۔

''خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان مرحوم'' یہ تحقیقی مضمون 99 صفحات پر مشتمل ہے جو مضامین فرحت (جلد چہارم) میں شامل کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب کا خواجہ امان سے ایک گہرا تعلق تھا وہ مرزا کے نانا کہلاتے تھے۔ اس کے علاوہ خواجہ امان نے ہی داستان ''بوستان خیال'' کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس مضمون میں مرزا صاحب نے خواجہ امان کا خاندانی

شجرہ بیان کرنے کے ساتھ مختلف اشخاص و افراد کے نام، حسب نسب، خاندانی حالات، اولاد وغیرہ کا ذکر بڑے ہی محققانہ انداز میں کیا ہے۔ چونکہ خواجہ امان نے ''بوستان خیال'' کا ترجمہ کرکے اردو ادب میں اپنی جگہ مسلم کرلی تھی تاہم مرزا صاحب کی خاندانی رشتہ داری اور خاکہ نگاری کے شوق نے اس تحقیقی مضمون کو لکھنے پر مجبور کردیا جس کے ذریعہ خواجہ امان کی مکمل شخصیت سے روشناس ہونے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے ترجمہ ازامان ''بوستان خیال'' کا تحقیقی جائزہ لیا ہے جہاں وہ دیگر ترجموں سے مقابلہ کرتے ہیں اور ان سب میں امان کی ترجمہ نگاری کو اول درجہ عطا کرتے ہیں۔ داستان کے ترجمہ کی پہلی جلد پر مرزا غالب نے دیباچہ بھی تحریر کیا تھا اور اسے خریدنے کے لیے اپنے عزیز و اقارب سے درخواست بھی کرتے تھے۔ خود مرزا صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب پہلی مرتبہ اکمل المطابع دہلی سے رضا خاں کے اہتمام سے طبع ہوکر نکلی۔ اسداللہ خاں غالب نے دیباچہ لکھا، نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ناصر الدین حیدر خاں نصرت جنگ جیسے لوگوں نے تقریظیں لکھیں اور سالک اور رضوان جیسے شعرا نے تاریخیں کہیں۔ غالب مرحوم نے تو یہاں تک کیا کہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو اس کتاب کے خریدنے کی دعوت دی۔''

(مرزا فرحت اللہ بیگ، مضامین فرحت حصہ چہارم، ص182)

تحقیقی مضمون ''حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان'' 106 صفحات پر مشتمل مضامین فرحت (جلد ششم) کا حصہ ہے۔ جس میں احسان کے حالات زندگی، عادات واطوار اور کلام پر تحقیقی کام کے ساتھ نمونۂ کلام پر بھی قابل قدر روشنی ڈالی ہے۔ نمونۂ کلام میں ساتھ ساتھ وہ اشعار پر تبصرہ اور داد بھی دیتے چلتے ہیں۔

مرزا صاحب کا ''نظیر اکبرآبادی'' پر تحقیقی مضمون 165 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم مضمون ہے جو کتابی شکل میں 1942 میں مرزا کے مقدمہ کے ساتھ ''دیوان نظیر'' کے عنوان سے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کرایا۔ یہ مضمون مضامین فرحت (جلد ہفتم) میں بھی شامل ہے۔ اس مقالے میں نظیر اکبرآبادی کے حالات زندگی، قد وقامت، لباس، مزاج، علمی صلاحیت سے لے کر ان کے کلام، منتخب اشعار، مختلف حامیوں و مخالفوں کی آرا کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ مضمون کئی کتابوں کی عرق ریزی کے بعد تحریر کیا ہے جس کا ذکر بھی انھوں نے براہ راست کردیا ہے مثلاً تذکرہ گلشن بے خار، تذکرہ گلستانِ بے خزاں، زندگانی بے نظیر۔ مرزا نے نظیر کی خوبی وخامی دونوں کو اجاگر کیا ہے۔

ادبی وتنقیدی مضامین میں ''اصلاح سخن سے متعلق میرے خیالات''، ''لیلیٰ مجنوں''، ''خان بہادر''۔ تاریخی مضامین میں ''خطبۂ صدارت اردو زبان کی مختصر تاریخ''، ''ساکھا''، ''آہ مظلوم''، ''آخری زار روس کا حشر''، ''فرماں بردار بیٹا''۔ دیگر موضوعات کے مضامین میں جاسوسی ''پیچ در پیچ'' اور ''بولتا ہوا اونٹ'' کا نام قابل ذکر ہے۔

المختصر یہ کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہاں ایک لمبی فہرست ایسے مضامین کی بھی ہے جو مضامین فرحت میں شامل نہیں ہیں بلکہ مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے، ان میں بھی موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے مثلاً خاندان کی تباہی، عشرت زبانی بیگم، مرزا صاحب کی مصوری، بے وقت کی راگنی، لاحول ولا، راز ہائے پنہاں، میرے حالات، بڑے میاں کے مرنے کے بعد، ندیدہ پن وغیرہ میں منفرد موضوعات کی حسین کاریگری دکھائی دیتی ہے۔ مرزا صاحب نے موضوعات کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کردیا تھا۔ ان کے ذہن وفکر میں موضوعات کو لے کر اس قدر تیز فہم وادراک رہا کہ وہ کہیں رک نہ سکے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیں کثیر التعداد مضامین کا ایک ایسا بیش بہا ذخیرہ دے کر رخصت ہوئے، جو ناقابل فراموش ہے۔

□□□

Asna Sahar
Research Scholar
Dept. of Urdu
Allahabad University
Prayagraj-211002 (U.P)
Mob: 8353914228

اپیل

ماہنامہ خواتین دنیا آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے اپنی گرانقدر رائے سے ضرور نوازیں۔ میگزین میں شائع ہونے والے مضامین، عنوانات اور مختلف ادبی شخصیتوں کی نشاندہی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ رسالے کو مزید بہتر بنانے میں ہمیں مدد مل سکے۔ (ادارہ)

شمع عظیم

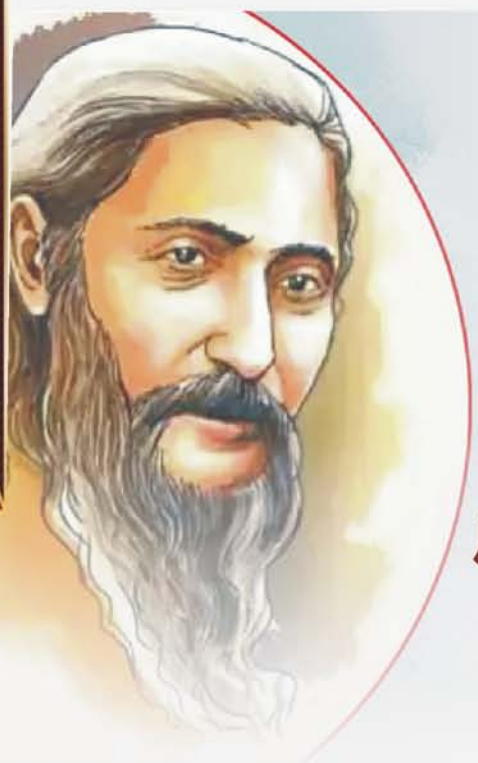

سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کی نظم 'سروج اسمرتی' ایک جائزہ

'سروج اسمرتی'' کے نام سے لکھ کر ظاہر کیا۔

''سروج اسمرتی'' ہندی ساہتیہ کا پہلا شوک گیت تسلیم کیا جاتا

کسی بھی دور اور کسی بھی ادب میں ایسے فن کار ضرور موجود ہوتے ہیں جن کے فن پارے عام انسانوں کے لیے مشعل راہ کا کام کرتے ہیں۔ ہندی ساہتیہ میں بھی ایسے تخلیق کاروں کی کمی نہیں۔ چھایہ وادی دور (رومانوی عہد) کی چار اہم شخصیات میں "جے شنکر پرساد، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، سمترانندن پنت اور مہادیوی ورما کا نام سب پہلے آتا ہے۔ ان میں سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا ایسے شاعر گزرے ہیں جن کا مزاج دوسرے فن کاروں کی بہ نسبت زیادہ انقلابی، جذباتی اور مختلف رہا۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرنا گوارہ نہیں کیا۔ ان کی تمام عمر دکھ، تکالیف اور آزمائش میں گزری، اس کے باوجود انھوں نے کوئی شکایت نہیں کی، کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ ہمیشہ پرامید ہو کر اپنی زندگی کو گزارتے رہے۔ ان کی زندگی میں ان گنت دکھ رہیں لیکن سب سے بڑا دکھ انھیں اپنی جوان بیٹی کی موت پر ہوا۔ اس ناقابلِ بیان تکلیف کو انھوں نے ایک طویل نظم

ہے۔ یہ نظم 1935 میں لکھی گئی اور 1938 میں ''انامیکا'' کے دوسرے ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ یہ نرالا کی پہلی ایسی نظم ہے جس میں ان کی ذاتی زندگی صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کو بیتا میں چار خاص موضوعات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پہلا ان کا بغاوتی اور انقلابی ذہن، دوسرا ان کی بیٹی سروج کے لیے بے انتہا محبت اور جذبات، تیسرا زندگی میں جدوجہد، توہین اور بقا کے لیے لڑی گئی جنگ میں ملی مایوسی اور درد کی شدت اور چوتھا سماج میں قائم کیے گئے فرسودہ رسم و رواج سے ہٹ کر چلنے کی تلقین اور حوصلہ۔

ہندی ساہتیہ میں نرالا پہلے وہ شاعر ہیں جنھوں نے شوک گیت کی شروعات کی۔ اس سے پہلے امیر خسرو، بھارتیندو وغیرہ کے یہاں کچھ اشعار اس طرح کے مل جاتے ہیں جس میں نوحہ یا چھاتی پیٹ کر درد بیان کرنے کا ذکر ہو لیکن ہندی ادب میں باقاعدہ طور پر شوک گیت یا مرثیہ کی ابتدا سوریہ کانت کی نظم 'سروج اسمرتی' سے ہوتی ہے۔ نرالا نے اس نظم میں اپنی انیس سالہ بیٹی کی موت پر افسردگی کا اظہار کیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ، نرالا ایک رونے پیٹنے والے شخص تھے۔ لیکن جب دکھ انسان کو پوری طرح توڑ دیتا ہے تب درد آنسوؤں کے سوتے کی شکل میں بہنے لگتا ہے۔ نرالا نے اپنی زندگی میں بہت دکھ جھیلے ہیں اور جب صبر کا یہ باندھ ٹوٹتا ہے تب دلخراش جملے ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ نہایت بے چین ہوکر اور تڑپ کر بیٹی سروج کا بچپن سے جوانی تک کے دور کو ایک گیت میں بیان کرتے ہیں:

اون وِنش پر جو پرتھم چَرَڑ
تیرا وہ جیون سِندھو ترَڑ؛
تننے، لی کر دِرک پات تڑَڑ
جنک سے جنم کا وِدا اَرڑ!
گیت میری، تَج روپ نام
وَر لیا امرَ شاشوت وِرام
پورے کر شُچی تر سَپَر یائے
جیون کے اشٹا دشادھیائے،
چڑھ مرتیو تَرَڑ پر تُرَڑر چَرَڑ
کہہ ''پِتا:، پُورڑ آلوک وَرَڑ

''فطرت کا نظام ہے جس طرح وقت آنے پر بارش ہوتی ہے، سیاہ بادل چھٹ جاتے ہیں، پھولوں کے پودوں پر کلیاں کھلتی ہیں، اسی طرح عورت کے جسم میں جوانی پھوٹتی ہے یوون آتا ہے۔ عورت کے اس روپ کو تقریباً سبھی تخلیق کاروں نے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا۔ ہندی ادب کی تاریخ میں نرالا شاید وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں اپنی بیٹی کی جوانی کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے لیے بہت ہی روشن خیالی، عزم اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ 'سروج اسمرتی' نرالا نے اپنی پیاری بیٹی کی یاد میں لکھی تھی اور اپنی بیٹی کی بچپن سے لے کر جوانی تک کی پوری تصویر فاری کے سامنے پیش کی ہے۔ عورت کے حسن و جمال، اس کے خدوخال، عارض و رخسار، ناگن جیسی زلفیں، بجلی جیسی مسکان، ہرنی جیسی چال اور سرو جیسے قد کا بیان عموماً ہر شعراء و ادباء کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن اپنی اکلوتی اور عزیز بیٹی کے نین، نقش اور جوانی کا بیان نرالا کے تخلیقی ذہن کا حصہ ہے''

کرتی ہوں میں، یہ نہیں مَرڑ
'سروج' کا جیوتی: شَرَڑ ترڑ!

اس نظم میں ایک باپ درد بھرے لہجے میں اپنی جوان بیٹی کی موت کی داستان بیان کرتا ہے کہ 'سروج' نے اپنی زندگی کی محض 18 بہاریں ہی دیکھی تھی اور ابھی انیسویں سال میں پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ اپنے روپ اور جوانی کو تیاگ کر اس جیون کی اٹل حقیقت یعنی موت کو گلے سے لگا لیا اور اپنے جنم داتا کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی۔ زندگی کے اٹھارہ برس بہت ہی کامیابی سے گزارنے کے بعد تیز قدموں سے موت کی ناؤ پر چڑھ گئی۔ نرالا کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی بیٹی کہہ رہی ہو کہ بابا یہ میری موت نہیں بلکہ میں اپنے حقیقی تخلیق کار کے پاس واپس جا رہی

ہوں۔جس نے مجھے تخلیق کیااوراس کائنات میں آپ کومیراجنک بنایامیں واپس اسی کے پاس جارہی ہوں۔ جہاں میں امر ہوں۔گرچہ نرالا اپنی بیٹی کی موت سے بہت اداس ہیں اس کے باوجود وہ مایوس نہیں وہ خوش ہیں کہ ان کی بیٹی اس دنیا کے جھمیلوں سے نجات پا گئی اور بہت ہی آسانی کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوگئی۔ وہ مری نہیں بلکہ امر ہوگئی ہے۔جس طرح 'گیتا' میں 18 ادھیائے ہیں نرالا کو گمان ہوتا ہے ان کی بیٹی بھی 'گیتا' کی طرح ہے جس کا جیون 18 سال (ادھیائے) مکمل ہونے کے بعد اس زندگی کی کتاب بند ہوگئی۔

دراصل انسان کو سوزِ درد کے واسطے تخلیق کیا گیا ہے۔ ہر ذی روح کو تکلیف ہوتی ہے پالتو طوطا بھی اگر بلی پکڑ لے تو انسان مچل جاتا ہے اگر جگر کے ٹکڑے کو درد پہنچے یا ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے تو انسان ٹوٹ جاتا ہے۔ ہندی ساہتیہ میں مہا پران کے نام سے پرشد سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو تمام عمر پریشان حال رہیں۔کبھی خانوادے کا غم، کبھی ذاتی تکالیف، کبھی مالی مجبوریاں تو کبھی حق نہ ملنے پر ہر طرف سے لعن طعن کیے جانے کا درد، سماج کا دُکھ تو کبھی پوری دنیا میں مچے کہرام کی فکر غرض نرالا کی زندگی مصائب و آلام کا مرکز رہی۔اتنی تکالیف پر کوئی بھی انسان ٹوٹ سکتا ہے۔نرالا بھی ایک انسان تھے جب درد سے سینہ پھٹنے لگا تو شاعری کا سہارا لیتے ہوئے اپنے غم کو تحریری شکل دینے کی کوشش کی۔

فطرت کا نظام ہے جس طرح وقت آنے پر بارش ہوتی ہے، سیاہ بادل چھٹ جاتے ہیں، پھولوں کے پودوں پر کلیاں کھلتی ہیں، اسی طرح عورت کے جسم میں جوانی پھوٹتی ہے یوون آتا ہے۔عورت کے اس روپ کو تقریباً سبھی تخلیق کاروں نے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا۔ ہندی ادب کی تاریخ میں نرالا شاید وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں اپنی بیٹی کی جوانی کی تصویر کشی کی ہے۔اس کے لیے بہت ہی روشن خیالی، عزم اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔'سروج اسمرتی' نرالا نے اپنی پیاری بیٹی کی یاد میں لکھی تھی اور اپنی بیٹی کی بچپن سے لے کر جوانی تک کی پوری تصویر قاری کے سامنے پیش کی ہے۔عورت کے حسن و جمال، اس کے خدوخال، عارض و رخسار، ناگن جیسی زلفیں، بجلی جیسی مسکان، ہرنی جیسی چال اور سرو جیسے قد کا بیان عموماً ہر شعراء و ادباء کے یہاں ملتا ہے۔لیکن اپنی اکلوتی اور عزیز بیٹی کے نین، نقش اور جوانی کا بیان نرالا کے تخلیقی ذہن کا حصہ ہے اور یہ سب لکھنے کے لیے واقعی بہت بڑا جگر چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ نرالا صحیح معنوں میں نرالا کہلانے کے مستحق ہیں۔

نرالا جب اپنی بیٹی 'سروج' کی شادی کرتے ہیں تو اس وقت 'سروج' کے چہرے پر جو خوشی ہوتی ہے اس کی داخلی اور ظاہری جو بھی کیفیات ہوتی ہیں انھیں احسن طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ایک بیٹی کے جذبات اور اس کے خدوخال کا بیان کوئی آسان کام نہیں۔لیکن نرالا کے جذبات اور سوچ میں جو پاکیزگی تھی وہ ان کی نظم 'سروج اسمرتی' کے ذریعے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے:

دیکھا وِواہ آمول نَول،
تجھ پر شُبھ پڑا کَلش کا جَلا
دیکھتی مجھے تو ہنسی مَند،
ہونٹوں میں بجلی پھینسی اَیسپند
اُر میں پر جھولی چھاتر سُدر
پریے کی اَشَبد مَریگار مُکھر
تو کھلی ایک اُچھواس سنگ،
وِشواس اَستبدھ بَیدھ اَگ اَگ
نَت نَین سے آلوک اتر
کاپا اَدھروں پر تھر، تھر تھر
دیکھا مین، وہ مورتی دِھیتی
مَر وَسنت کی پرتھم گانتی

ان اشعار میں سماج میں رائج فرسودہ ریتی رواج پر بھی طنز کیا گیا ہے اور بغاوت کی گئی ہے۔اس کا ثبوت بھی درج بالا سطروں میں مل جاتا ہے۔کیونکہ نرالا نے اپنی بیٹی کی شادی رائج کردہ روایت سے ہٹ کر کی۔ انھوں نے اپنی عزیز دختر کو جہیز دیا اور نہ شادی میں کسی قسم کی غیر ضروری روایتوں کو ملحوظ رکھا۔ عام روایتوں سے ہٹ کر یا ان سے بغاوت کرتے ہوئے انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی کی اور یہی بغاوتی رویہ نرالا کا خاصہ رہا ہے جو انھیں اوروں سے ممتاز بناتا ہے۔'سروج' نظم کا مرکزی کردار ہے لیکن اس میں نرالا کی زندگی کی جدوجہد کا اظہار بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔جیسے:

کم نصیب باپ کی جدوجہد
معاشرے کے ساتھ نرالا کے برے تعلقات
بیٹی کے لیے زیادہ کچھ نہ کر پانے کا درد
زندگی کی ناہمواریوں، ستم ظریفیوں اور غفلتوں کی
عکاسی

درج ذیل نظم کے اس شعر میں ذاتی دکھ واضح طور پر سامنے آتا ہے:

دکھ ہی جیون کی کتھا رہی
کیا کہوں آج جو نہیں کہیں

یہ شعر ادبی زندگی کی جدوجہد کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ اس ایک شعر میں نرالا نے اپنی زندگی کا ماحصل بیان کر دیا ہے۔ ان کی تمام تکالیف کو ایک شعر کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے۔ اس طرح نظم 'سروج' کی ہی نہیں نرالا کی بھی سوانحی نظم بن جاتی ہے۔

نرالا نے ہمیشہ سماج سے بغاوت کی ہے۔ ایسے دور اور ادب میں ایک سوک گیت (مرثیہ یا تعزیتی نظم) لکھنا جو اس عہد اور اس ادب کا چلن ہی نہیں رہا ہو۔ ان کے روڑی بند نہ ہونے کا اول ثبوت ہے۔ سنسکرت یا ہندی ساہتیہ کی رچنائیں 'سوکھانت' (Happy Ending) ہوا کرتی تھیں۔ مرن (موت) کا چرچا بھارتیہ ادب کا حصّہ نہیں رہا۔ یہ مغرب اور عربی ادب کا حصہ تھا۔ نرالا نے شوک گیت کی رچنا کر اسے ہندی ساہتیہ سے جوڑا اور ایسا سماج جہاں لوگ بیٹا ہونے کی کامنائیں کیا کرتے تھے اور بیٹی سماج پر کلنک کلپنا کی جاتی ہو ایسے وقت میں ایک باپ اپنی بیٹی کے لیے ٹرپ رہا اور رو رہا ہو۔ یہ اپنے آپ میں غیر معمولی بات ہے۔ لوگ اپنی زندہ، بیوی، بیٹی، بہن اور بہو کی بات کرنے سے کتراتے ہیں ایسے میں نرالا نے مری ہوئی بیٹی کی سندرتا کو اس کے بال پن کو اس کی جوانی کو اپنی لاچاری اور بے بسی میں بیان کیا ہے۔

نرالا نے 'سروج اسمرتی' میں 'کرون' دکھ رس کو بیان کیا ہے۔ جو اس عہد میں قابلِ قبول نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے ایڈیٹر نیرانند جو آنند میں ڈوبے ہوئے تھے انہیں 'شرنگار رس' کی رچنائیں پسند آتی تھیں۔ نرالا ایسے انتظامیہ اور سماج سے اُکتائے ہوئے تھے۔ ہندی والوں نے مہاپران کے ساتھ ان کی تخلیقات کو خصوصاً 'سروج اسمرتی' کو شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کا علاج بھی نہیں کروا پاتے اور وہ ٹی۔بی جیسی بیماری میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے وداع ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود بھی نرالا لوک منگل نہیں چھوڑتے اور جو بھی ممکن ہوتا ہے سماج کے کلیان کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ نرالا خود کو دھتکارتے ہیں کہ میں کیسا باپ تھا اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ لکھتے ہیں:

دَھنیے، میں پِتا نِرتھک تھا
کچھ بھی تیرے ہِت نہ کر سکا
جانا تو اَرتھاگمو پائے
پر رہا سدا سنکوچت کائے
لکھ کر اَنرتھ آرتھِک پتھ پر
ہارتا رہا میں سوارتھ سمر
سوچتے پہناکر چینانشک
رکھ سکا نہ تجھے اَتہہ دَدھی مُکھ
چھیڑ کا نہ چھینا کبھی اَنّ
میں لکھ نہ سکا وے دِرگ وِپن!
اپنے آنسوں اتہہ ہِمت
دیکھے ہیں اپنے ہی مکھ چت
سوچا ہے نت ہو بار بار
''یہہ ہندی کا اِسنیہو پہار
یہہ نہیں ہار میری، بھاسوَر
وہ رتنا ہار لوکوتّر وَر
اَیتھا، جہاں ہے بھاؤ شُدھ
ساہتیہ کلا گوشل پربدھ

مختصر یہ کہ "سروج اسمرتی" میں چھایاواد کی تمام خصوصیات جیسے 'ویکتی واد، ناری چیتنا، پراکرتی چیتنا، راشٹریہ جاگرن، ویدناواد، پیڑاواد، کلپنا شیلتا، مکت چھند وغیرہ موجود ہیں۔ اسی کے ساتھ شوک گیت کی بھی جو خاصیت ہیں مثلاً 'پریہ کی اسمرتیاں (اقارب کی یادیں)، آتمیہ ابھاؤ پر چھوپ، پرمپرہ یا روایتوں پر طنز، اپنی زندگی کے لیے کوئی سبق وغیرہ کو نظر میں رکھتے ہوئے شوک گیت لکھے جاتے ہیں۔ نرالا نے اس کا بھی خیال رکھا ہے۔ اس طرح چھایہ وادی اور سوک گیت کی تمام خوبیاں اس گیت میں موجود ہیں۔ 'سروج اسمرتی' اپنی تمام تر خصوصیات کی بنا پر ہندی ساہتیہ ہی نہیں بھارتیہ سنسکرتی کے اعتبار سے بھی ایک اہم اور غیر معمولی تخلیق ہے۔ ایک باپ کا اپنی بیٹی کے لیے تڑپنا اور اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی کو اپنی مری ہوئی بیٹی پر نیو چھاور کر دینا اپنے آپ میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔ نرالا کا یہ غم ان کا نہیں بلکہ سماج کا درد بن جاتا ہے اور یہی ایک فن کار کی سب سے بڑی خاصیت ہوتی ہے کہ وہ غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنا دیتا ہے۔

❐❐❐

Shama Azeem
Research Scholar
Burdwan University
Titagarh, Kolkata - 700119 (West Bengal)
Mobile: 9038759231

عظمیٰ رضوان

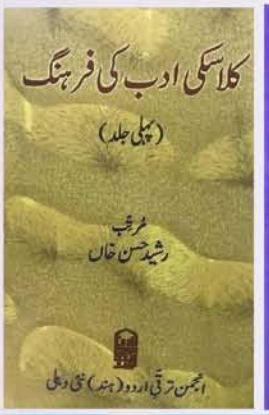

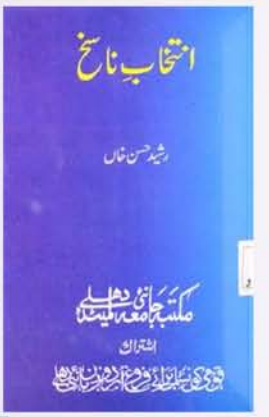

رشید حسن خاں حیات اور کارنامے

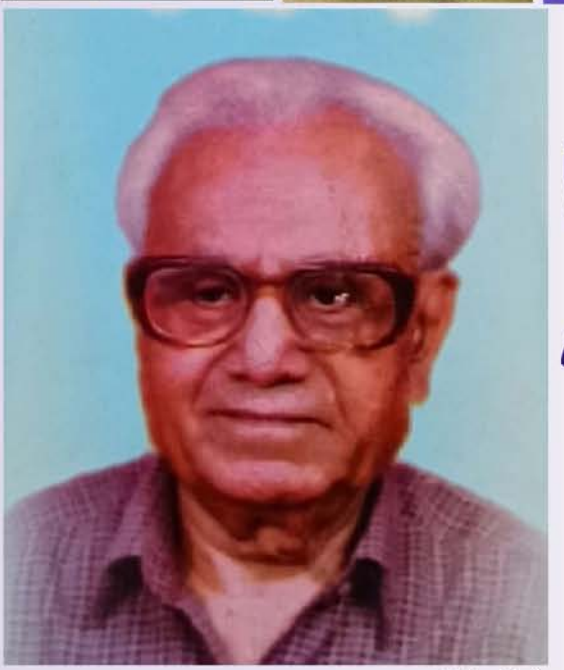

رشید حسن خان تحقیق، ترتیب اور تدوین متن کے میدان میں ایک قدآور شخصیت کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کو اس فن میں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اس میدان میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قابل صد تحسین بھی ہیں اور قابل صد شکر بھی۔ رشید حسن خاں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کے کلاسیکی فن پاروں کو جدید اصول وضوابط کی روشنی میں ترتیب دے کر عام فہم بنا دیا۔ تحقیق و تدوین کے میدان میں ان سے زیادہ دیدہ ور اور نبرد آزما محقق نظر نہیں آتا۔

دہلی یونی ورسٹی میں تقرر کے بعد رشید حسن خاں کی خوبیوں کے جوہر کھلنے شروع ہوئے اور خوب کھلے، لیکن قطرے کو گہر بننے میں صرف وقت ہی نہیں لگا بلکہ خون جگر بھی صرف کرنا پڑا، رشید حسن خاں اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہماری قدیم ادبی روایت کے امین تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کے تدوین کردہ اہم کارناموں میں جہاں تحقیقی ذوق غالب نظر آتا ہے وہیں تنقیدی شعور بھی بھرپور انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں کو قدرت نے ان دونوں صفات (تحقیق و تنقید) سے یکساں طور پر نوازا تھا۔ انھیں خوبیوں کے پیش نظر گیان چند جین نے کہیں لکھا ہے کہ ''میں انہیں پیغمبر تدوین کہنے پر قانع نہیں، انھیں خدائے تدوین کہوں گا'' یہاں ڈاکٹر صابر علی سیوانی کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں جو بڑی حد تک رشید حسن خاں کے کمالات کی طرف توجہ مرکوز کراتا نظر آتا ہے:

> ''رشید حسن خاں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جن کلاسیکی متون کی تدوین کی، اس میں تدوین متن کے اصولوں کی مکمل طور پر پیروی کی، مقدمہ لکھا، حواشی تحریر کیا، صحت متن کا کام کیا، تعلیقات پیش کیا، اشاریے بنائے اور فرہنگ مرتب کی اور سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے تمام متون کی تدوین میں منشائے مصنف کو پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ متون کی تدوین سائنٹفک انداز سے کیسے کی جاتی ہے۔ ان متنوں پر اعراب نگاری کا بھی فریضہ انجام دیا۔''

(''تدوین متن کی روایت آزادی کے بعد'' ڈاکٹر صابر علی سیوانی۔ روشان پرنٹرس دہلی، 2021 ص:697)

رشید حسن خاں کی پیدائش 25 دسمبر 1925 کو شاہجہاں پور

یوپی میں ہوئی۔ان کا تعلق پٹھانوں کے مشہور خاندان یوسف زئی سے تھا۔ ان کے والد امیر حسن خان محکمۂ پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ان کے دادا علی حسن خان انگریزی فوج میں ملازم تھے۔والد صاحب ایک کٹر قسم کے قوم پرست انسان تھے،اس وجہ سے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت بھی کرتے تھے،لہٰذا انھوں نے رشید حسن خاں کا داخلہ شاہجہاں پور کے دینی مدرسے بحرالعلوم میں کرادیا۔جہاں رشید حسن خاں نے 1934 سے 1940 تک اپنے استادِ محترم مفتی مجتبیٰ حسن خان سے عربی پڑھی۔اس کے علاوہ خود اپنے معنوی اساتذہ میں محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی عرشی کا ذکر کرتے ہیں۔لیکن افسوس کہ بحرالعلوم میں تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی آپ کا تعلیمی سلسلہ کچھ وقت کے لیے منقطع ہوگیا۔جس کے بعد اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا، پھر طُرفہ تماشہ یہ کہ والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا اور مالی حالات اس قدر بگڑیں کہ مجبور ہوکر آرڈیننس کلوتھنگ فیکٹری (Ordannce Clothing Factory) میں بحیثیت ملازم کام کرنے لگے۔ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ ٹریڈ یونین کے قیام اور مزدوروں کی وکالت کے جرم میں انھیں ملازمت سے نکال دیا گیا۔اور اس کے بعد گویا تنگی نے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔الغرض چھوٹے موٹے کام کے ساتھ گیہوں پیسنے والی چکی پر بحیثیت منشی کام کرنے لگے،لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ ان مشکل حالات میں بھی مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا اور اسی دوران الہ آباد یونی ورسٹی سے مولوی اور دبیر کامل کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور 1949 میں مدرسہ ''فیض عام'' میں مدرس ہوگئے،لیکن چہرے پر داڑھی کی عدم موجودگی کے سبب نچلے درجے کے طلبا کو پڑھانے پر معمور کردیے گئے،بعد ازاں 1953 ''اسلامیہ ہائر سیکنڈری'' میں اردو اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔اس کے بعد خدا کی خصوصی رحمت کا نزول ہوا اور 1959 میں خواجہ احمد فاروقی کے توسط سے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں عارضی طور پر Research Assistant مقرر ہوئے۔پہلے یہ عہدہ وقتی تھا لیکن 1964 میں اسے کل وقتی منظوری حاصل ہوئی اور 1964 میں ان کی نوکری باضابطہ طور پر مستقل ملازمت میں تبدیل کردی گئی۔جہاں انھوں نے 1989 تک خدمت انجام دی اور اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی ملازمت سے دست برداری اختیار کرلی۔اس کے بعد اپنی بقیہ زندگی اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں صرف کردی،اور تحقیق وتدوین کا یہ مایہ ناز ستارہ 26 فروری 2006 میں اپنے حقیقی مالک سے جاملا۔

رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1944 میں تنقیدی مضمون لکھ کر کیا،انھوں نے فکشن کی تنقید کے علاوہ زبان وقواعد پر بھی مضامین لکھے جو اپنے زمانے کے مشہور ومعروف ادبی رسائل مثلاً: ادیب، نیا دور، ایوان اردو، الحمرا اور نگار وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ان کے تحقیق وتدوین کردہ کارناموں میں بڑی تہہ داری ہے،ان کے کاموں کی قدر و قیمت کا اہل نظر نے برملا اعتراف کیا ہے۔ان کی تخلیقی خوبیوں کا اندازہ مندرجہ ذیل سطروں میں ذکر کیے گئے فن پاروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

رشید حسن خاں کے کارناموں میں بہت سے پہلو نظر آتے ہیں مثلاً مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب اور دیوان کی ترتیب وغیرہ کا کام انجام دیا اس فہرست میں: انتخاب نظیر اکبرآبادی 1970، انتخاب شبلی 1971، انتخاب مراثی انیس و دبیر 1971، دیوان خواجہ میر درد 1971، انتخاب سودا 1972، انتخاب ناسخ 1972ء کا شمار ہوتا ہے۔

اسی طرح رشید حسن خاں نے اردو زبان وادب کی قواعد سے متعلق بھی چند کتابیں تصنیف کی ہیں مثلاً: اردو املا 1974، اردو کیسے لکھیں 1975، زبان وقواعد 1976، انشا وتلفظ 1994، عبارت کیسے لکھیں 1994 وغیرہ۔

تنقیدی نقطۂ نظر کے حوالے سے لکھے گئے مضامین کے بھی دو مجموعے رشید حسن خاں کے شائع ہوچکے ہیں ان میں تلاش وتعبیر 1988 اور تفہیم 1993 کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

تحقیق وتدوین کی دنیا میں رشید حسن خاں نے جو اصول وضوابط

قائم کیے ہیں ان کے حوالے سے اور اس کی روایت کے حوالے سے بھی اہم معلومات پر مبنی ان کی دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو اس طرح ہیں: ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ 1978، تدوین، تحقیق اور روایت 1999۔

لیکن تحقیق کی دنیا میں جن کارناموں نے رشید حسن خاں کو لازوال بنا دیا وہ کلاسیکی ادب کی تدوین و ترتیب ہے۔ ان میں ''فسانہ عجائب 1990، باغ و بہار 1992، مثنوی گلزار نسیم 1995، مثنویات شوق 1998، سحر البیان 2002، مصطلحات ٹھگی 2002، کلیات جعفر زٹلی 2003ء'' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انشائے غالب 1994، املائے غالب، حیات سعدی، نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، موازنہ انیس و دبیر، گذشتہ لکھنؤ، مقدمہ شعر و شاعری، دستنبوں کا اردو ترجمہ، دیوان حالی اور گنجینہ معنی کا طلسم (جلد اول، دوم، سوم) کا شمار بھی تدوین کردہ کارناموں کی فہرست میں ہوتا ہے۔

رشید حسن خاں کی ترتیب و تدوین کا انداز انوکھا اور نرالا تھا، اس کا اندازہ ان کے ترتیب کردہ کلاسیکی متون کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ جس یک سوئی اور دل جمعی کے ساتھ تدوین کے کام کو پورا کرتے ہیں وہ اپنے آپ میں کسی مثالی انداز سے کم نہیں۔ کیونکہ ان کے ترتیب کردہ کاموں میں جتنی گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے وہ کسی دوسرے مدون میں نہیں ملتی، اور جو چیز رشید حسن خاں کو دوسروں سے منفرد بناتی ہے وہ تدوین کے میدان میں اس کے اصول و ضوابط کی پابندی اور پیروی ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنے تدوینی کام کو جس لگن اور دیدہ ریزی کے ساتھ انجام تک پہنچایا ہے اس کی مثال فسانہ عجائب کی ترتیب کے وقت پیش آئے اس واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جس کو قمر رئیس نے فسانہ عجائب مرتب رشید حسن خاں کے پیش لفظ میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس کام یعنی (فسانہ عجائب کی تدوین) کو کس طرح کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کام مکمل ہو چکا تھا، متن کی کتابت بھی ہو چکی تھی، کہ اچانک ان کو اس کتاب کا ایک ایسا نسخہ ملا جس پر مصنف نے آخری بار نظر ثانی کی تھی۔ رشید صاحب نے بلا تکلف پچھلے پانچ سال کے سارے کام کو کالعدم قرار دے دیا اور اب اس نئے نسخے کی بنیاد پر متن کو نئے سرے سے مرتب کیا، غرض کہ اس کتاب کی تکمیل میں اس طرح کم و بیش آٹھ سال صرف ہوئے ہیں۔''

(''فسانہ عجائب'' مرتب رشید حسن خان۔ مشمولہ ''پیش لفظ''۔ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1990۔ ص 10)

رشید حسن خان کے تمام ادبی کارناموں اور تخلیق کردہ کاوشوں کے مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تدوین و ترتیب کی روایت کا عرفان اور احترام دونوں موجود ہے اور ساتھ ہی اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے بل بوتے پر میدان ادب کو مار لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں، جب کہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی نظر نا تو میراث پر تھی اور نہ منصب پر اور نہ ہی ان کے پاس سہارے کے لیے ڈاکٹر یا پروفیسر کی کوئی بیساکھی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے تحقیق و تدوین کے بے مثال کارناموں کے سبب ادبی حلقوں میں کبھی نہ مٹنے والی شناخت قائم کی۔ رشید حسن خاں کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مخمور سعیدی کے یہ اشعار موقع اور مناسبت کے اعتبار سے موزوں معلوم ہوتے ہیں جس پر میں نے مقالے کا اختتام کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مصورِ علم و فضل ذات تری
تجھ سے مشتق ہیں سب صفات تری
سب سے ممتاز ہم سروں میں تو
مختلف سب سے کائنات تری

کتابیات

1. تدوین متن کی روایت آزادی کے بعد، ڈاکٹر صابر علی سیوانی، روشان پرنٹرس دہلی 2021
2. فسانہ عجائب، مرتب رشید حسن خان، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی 1990
3. رشید حسن خاں کی ادبی جہات، ڈاکٹر ابراہیم افسر، اصیلا آفیسٹ پرنٹرس، نئی دہلی 2021
4. رشید حسن خان تحریروں کے آئینے میں مرتب ابراہیم افسر، ایچ، ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، جلد اول 2019

□□□

Uzma Rizwan
Mohalla Maulaganj
Post Shahabad
Distt-Hardoi-241124 (U.P)
Mobile No. :7985275448
Email:uzmarizwan042@gmail.com

ام جوزی

صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری

اردو ادب کا دائرہ کافی وسیع وعریض ہے، جس کے لیے ہمارے ادبا وشعرا نے اپنی فنی لیاقتوں اور اپنے خونِ جگر کو قلم کی سیاہی بنا کر اردو ادب کو دوسری زبان کے ترقی یافتہ ادب میں نمایاں درجہ عطا کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بالخصوص ہندوستان میں ہمارے ادبا وشعرا نے جو اپنی تخلیقی سرگرمیاں انجام دی ہیں ان سے اردو ادب کی ترویج وترقی کے راستے کشادہ ہوئے ہیں۔ ادبی تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاعری اور داستان نے اردو ادب پر اپنا سایہ برقرار رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ جس طرح کائنات کے نظام میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اسی طرح ادب میں بھی نئے اصناف کا وجود لازمی ہوتا رہتا ہے۔ ایک دور میں داستانیں اپنے عروج پر تھیں، ہر ادیب یا تخلیق کار اپنے آپ کو اس وقت تک مکمل ادیب تصور نہیں کرتا تھا جب تک وہ داستان نویسی کے رنگ میں نہ رنگ جاتا تھا۔ اسی طرح یہ بات غور طلب ہے کہ جب ادبی تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوا، وقت کی اہمیت و افادیت کا احساس ہونے لگا تو صنف ناول کا وجود عمل میں آیا۔ ناول نگاروں نے جب داستان کی جگہ لی تو اس وقت ناول بھی بہت ضخیم ہوا کرتے تھے۔ داستانوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان میں مافوق الفطری عناصر کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ جیسے جن، دیو، پریوں کے خیالی قصے بیان کیے جاتے تھے، جس سے ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات کو بہت حد تک پاک کرنے کی کوششیں کیں اور ان کی جگہ زمانی حالات واقعات، شب وروز شعبہ حیات میں رونما ہونے والے مسائل کو اور سماجی سطح کے مسائل کی سچی تصویریں پیش کر کے ناول نگاری کا اردو ادب میں ایک نیا باب قائم کیا۔ اردو ادب میں ناول نگاروں کی صف میں ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا، کرشن چندر، منٹو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی حیات کا طویل سفر ناول نگاری کی پُر خار وادی میں طے کیا اور سماجی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کو اپنی تحریروں کے ذریعہ منظر عام پر لاتے رہے، جس کی بنا پر صنف ناول کے قد میں وسعت پیدا ہوتی رہی۔

ناول نگاری کا سلسلہ عہد حاضر میں بھی ادبی میدان کو گلزار بنائے ہوئے ہے۔ جب ہم عہد حاضر میں ناول نگاروں کے مطلع پر تابندہ ستاروں کو دیکھتے ہیں تو اس وسیع وعریض مطلع پر جہاں مردوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے وہیں خواتین نے بھی اس پر اپنی تخلیقی چمک بکھیری ہے۔ کوئی بھی میدان ہو آج کی پڑھی لکھی خواتین نے اس میں اپنا اہم کردار ادا کر کے اپنی منفرد پہچان قائم کی ہے۔ ناول نگاری کے میدان میں بانو قدسیہ، رشید جہاں، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، جمیلہ ہاشمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اپنی فنی بصیرتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ناول

نگاری میں مختلف موضوعات کو جگہ دے کر ہندوستان میں اردو ناول نگاری کو ترویج و ترقی سے ہمکنار کیا۔ ناول نگاری ایک مشکل صنف ضرور ہے جس میں خواتین کی تعداد مردوں کی بہ نسبت کم نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود وقتاً فوقتاً خواتین ناول نگاروں نے اپنے جذبات و احساسات کے ذریعے عہد حاضر کے مسائل کو ناول نگاری کے ذریعے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ جن میں وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ ناول نگاری کی اسی روایت کو وسعت بخشنے والی خواتین ناول نگاروں میں ایک اہم نام صالحہ عابد حسین کا بھی ہے۔

صالحہ عابد حسین کا شمار دور جدید کے اہم افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈرامہ نویس کی صف میں ہوتا ہے۔ وہ خواجہ غلام الثقلین کی بیٹی اور نامور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی کی نواسی تھیں۔ انھوں نے اردو ادب کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی، لیکن صنف ناول سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ ان کے اب تک نو ناول، عذرا، کفش خاموش، راہ عمل، قطرے سے گہر ہونے تک، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، الجھی ڈور، گوری سوے سیج پر اور ساتواں آنگن ہیں۔ اس کے علاوہ افسانوی مجموعے، ڈرامے، سفرنامے بہت سی کتابوں کے ترجمے اور ریڈیائی تحریروں پر بھی کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ ادب اطفال کے حوالے سے متعدد کتابیں اور کہانیاں لکھیں، ان کی اب تک پچاس سے زیادہ کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کو ہندوستان کی مختلف اردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازا۔ جیسے غالب ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، سرسوتی ایوارڈ اور پدم شری ایوارڈ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مصنفہ کی سب سے زیادہ شہرت ناول نگاری کی بدولت ہی ہوئی۔ ان کا سب سے ناول اہم عذرا ہے جو 1949 میں شائع ہوا۔ اس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس طرح ایک کے بعد ایک ناول شائع ہوتے گئے۔ ناول عذرا جس وقت لکھا گیا اس وقت ہر مذہب اور طبقے کے لوگ جنگ آزادی میں شریک ہو رہے تھے۔

اس ناول کی ہیروئن عذرا ایک باصلاحیت لڑکی ہے۔ وہ پورے معاشرے کی ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی خیر خواہ ہے۔ وہ اپنی شادی کے لیے اپنے جیسے خیالات رکھنے والے لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ اس کا شوہر انصار بھی ایک قابل لڑکا ہے۔ وہ اپنا ایک ذاتی اخبار نکالتا ہے، جس میں ملک کی آزادی اور جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے مضامین چھاپتا ہے۔ اس آزادی کی جدوجہد میں اس کو جیل ہو جاتی ہے، تو اس کی بیوی عذرا رونے کے بجائے اس پر فخر محسوس کرتی ہے کہ وہ ملک و قوم کی بھلائی کے لیے جیل گیا ہے۔ انصار کے جیل جانے پر جب لوگ اس کو حوصلہ دینے کے لیے اس کے پاس آتے ہیں تو اس کی باتوں سے اس کی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"یہ کوئی شرم کی نہیں بلکہ فخر کی بات ہے۔ وہ کوئی چوری، ڈکیتی، قتل و غارت کے جرم میں جیل نہیں گئے، ملک کی خدمت کرتے ہوئے آزادی کی خاطر گئے ہیں۔"

(عذرا، صالحہ عابد حسین ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

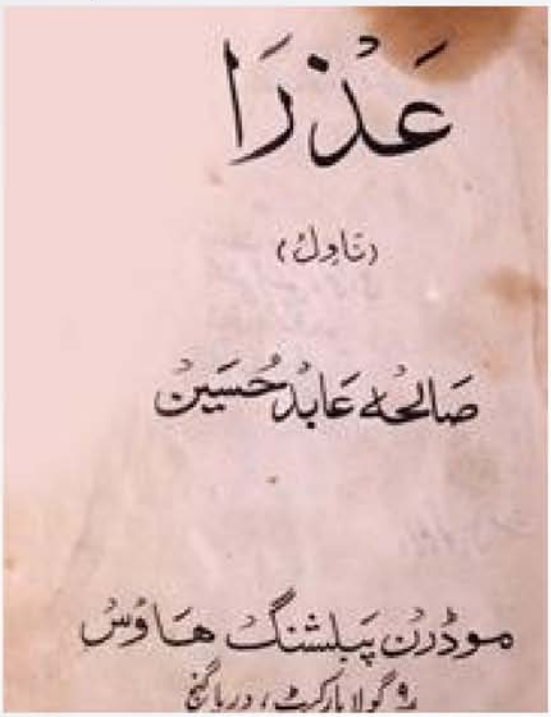

ناول کے مطالعہ سے اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا شوہر جیل جاتے وقت اخبار کی ساری ذمہ داری اسی پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے، جسے وہ ایمانداری سے نبھاتی ہے۔ حالانکہ عذرا کے بزرگ اس بات کی مخالفت کرتے ہیں لیکن وہ اپنے بزرگوں کے بجائے اپنے شوہر کی بات مانتی ہے۔ وہ بخوبی جانتی ہے کہ اس کا شوہر ملک و قوم کی آزادی چاہتا ہے اور اس کا اخبار ملک و قوم کو آزادی دلانے میں مدد کرے گا۔

اس ناول میں عذرا ایک جیتا جاگتا اور متحرک کردار ہے۔ اسے تعظیم سے بہت دلچسپی ہے۔ پیسوں کی کمی ہونے کے باوجود بھی وہ غریب بچوں کو تعلیم دلانے میں مدد کرتی ہے۔ وہ وطن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے اس میں خامیاں بھی ہیں مگر اس کی خوبیاں اس کی خامیوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اس ناول کا ہر کردار مثالی ہے، انصار کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک خوش مزاج اور با اخلاق انسان ہے، اپنے اصولوں کا پابند ہے، وہ اپنی بیوی کو

چھوڑ کر مزدوروں اور غریبوں کے غم کو دور کرنے اور اپنے وطن کی آزادی کے لیے خوشی خوشی جیل چلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نسیم بیگم، حمیدہ بیگم، رضیہ، چچا، حبیب، ربانی، فرخ، سبدہ، اصغر، حاجرا وغیرہ بھی کردار اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں اور ناول کے اعلیٰ معیار کی ضمانت پیش کرتے ہیں۔ اس ناول کی کامیابی کا دارومدار کرداروں کی اصلیت پر مبنی ہے۔ صالحہ عابد حسین نے کردار نگاری کے فرائض بخوبی انجام دیے ہیں۔ ان کے یہاں ہر کردار بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے اپنے ناولوں میں اپنے عہد کے حالات اور واقعات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ان کے ناول حقیقت پسندانہ روایت کے ترجمان ہیں۔ یہ ناول بہت سادہ اور آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کا سب سے بڑا حصہ واقعہ نگاری اور طرز تحریر ہے۔ انداز بیان دلکش ہے۔ مکالموں کی بے تکلفی کرداروں کے نفسیاتی مطالعے کا ایک معیار ہے جو مصنفہ کی تخلیقی صلاحیتوں اور ذہنی مشاہدے کا ثبوت ہے۔

نزہت فاطمہ' صالحہ عابد حسین بحیثیت ناول نگار (مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ) سن اشاعت 1974 صالحہ عابد حسین کا دوسرا ناول ہے، جو 1963 میں شائع ہوا۔ اس ناول کو ان کے ٹریجڈی ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس ناول کو بھی بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ناول کی ہیروئن انجم ہے، وہ ولایت سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرتی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ اس کے دل میں جہاں ایک طرف محبت کی آگ ہے وہیں دوسری جانب قوم کی خدمت کا جذبہ بھی ہے۔ لیکن حالات اس محبت کو پروان نہیں چڑھنے دیتے، اس کے باوجود بھی وہ مایوس نہیں ہوتی اور نہ ہی زندگی سے بیزار ہوتی ہے بلکہ وہ اپنے محبت کے خزانے کو خدمت کی راہ میں لٹانے پر تیار ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر قوم کے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے اور ان کی تعلیمی تربیت کرنے میں اس طرح مشغول ہوجاتی ہے کہ اسے اپنی ذات کا بھی ہوش نہیں رہتا اور اپنی آخری سانس تک اس فرض کو ادا کرتی ہے۔ وہ ڈاکٹر جاوید سے محبت کرتی ہے اس لیے ڈاکٹر یوسف کے پیغام کو قبول نہیں کرتی کیوں کہ وہ بنا محبت کے شادی نہیں کرنا چاہتی۔

اس ناول میں انجم کا کردار مثالی ہے۔ وہ ایک عام انسان کا ہی کردار ہے۔ صالحہ عابد حسین کا کمال یہ ہے کہ ان کے ناول پڑھ کر قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس ماحول اور فضا میں پہنچ گیا، جہاں اس کے کردار سانس لے رہے ہیں اور قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔

انجم کا کردار جاوید کے کردار سے بھی اہم ہے، وہ بہت خوش مجاز اور پُرخلوص ہے۔ ڈاکٹر جاوید سے محبت کرتی ہے لیکن ان کی پہلی بیوی کی ہمدردی میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اس بات سے اس کے کردار کی بلندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں کچھ کردار قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر یوسف، نادرہ، نانی ماں، عباسی صاحب وحسینہ بیگم، شیخ جی، شاہد، بوڑھے شیخ جی وغیرہ۔

اس ناول پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اس کے کردار حد سے زیادہ مثالی ہیں۔ ایسے کردار دنیا میں بہت کم نظر آتے ہیں کہ لوگوں کو اس ناول میں کسی خاص قسم کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس ناول کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ روشنی کی تلاش میں اپنی روح کو اندھیرے سے بچائے رکھنا ہی انسان کی معراج ہے۔ (صالحہ عابد حسین دیباچہ اول آتش خاموش، چوتھا ایڈیشن 1986، نسیم بک ڈپو لکھنؤ)

صالحہ عابد حسین نے آتش خاموش کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''سیکڑوں انسانوں کی سیرت کردار اور اعمال وغیرہ کا گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد ناول نگار ایسے زندہ کردار کی تخلیق کرسکتا ہے جس پر لوگوں کو اصل انسان ہونے کا گمان ہونے لگے اور یہ بات سچ ہے کہ ان کا ہر کردار اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔'' (سہیل بخاری، اردو ناول نگاری ہندوستان، لکھنؤ پرنٹنگ پریس، دہلی، سن اشاعت 1972 ص:249)

ناول ''قطرے سے گہر ہونے تک'' میں صالحہ عابد حسین نے ایک نیا تجربہ پیش کیا ہے، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ اس ناول کی ہیروئن انیس ہے، جو بہت ہمدرد، مخلص، محبت کرنے والی اور نیک خیال عورت ہے۔ جو بچپن ہی میں ماں کی محبت وشفقت سے محروم ہوجاتی ہے۔ اس کی سوتیلی ماں اس پر ظلم کرتی ہے، اس وجہ سے انیس کے ماموں عابد علی اس کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔ اچھی تعلیم دلاتے ہیں اس کے بعد اقبال سے اس کی شادی کردیتے ہیں۔ اقبال کی آمدنی محدود ہونے کے باوجود وہ مائیکے اور سسرال دونوں کی ذمہ داریاں نبھاتی ہے۔ اس کے شوہر اپنے غریب اور مستحق لوگوں کے ہی مددگار ہیں۔ انیس کا بچہ بھی پیدائش کے چند گھنٹے بعد مرجاتا ہے، پھر بھی وہ بہت صبر سے کام لیتی ہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی سوتیلی ماں اور بہن کو بھی اپنے گھر لے آتی ہے۔ وہ ایک اچھی بیوی، بیٹی، بہن، دوست اور عاشق زار بھانجی ہے۔ اس لیے اس کے کردار کو مثالی کردار کہا جاسکتا ہے۔

صالحہ عابد حسین کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی سادگی، سلاست، روانی اور صداقت ہے۔ مذکورہ ناول کو پڑھ کر ان کی بلند خیالی کا

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ناول کا ہر کردار اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ ہر کردار عام انسان کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، جس میں خوبیاں اور خامیاں دونوں شامل ہیں۔ ناول میں زبان کی شائستگی اور شگفتگی، طرز ادا کی ندرت اور بلا کی سادگی موجود ہے یہ ناول اردو ادب کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس پر مصنفہ کو حکومت اتر پردیش کی جانب سے انعام و اکرام سے بھی نوزا گیا ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر قاری کو یہ احساس ہوتا ہے جس کی مکمل تصویر ڈاکٹر قمر رئیس کے اس اقتباس سے واضح ہوجاتی ہے:

''ناول میں زندگی کی تفسیر و تدبیر بے شک ناول نگار کے شعور فن کی اسیر ہوتی ہے لیکن ناول لکھنے کی تحریک اس وقت ہوتی ہے جب اس زندگی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے اور کچھ کہنے کی خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اس زندگی کی ماہیت پر اثر انداز ہونے والی تاریخی، سماجی اور ذہنی قوتوں کے مزاج اور افتاد کو سمجھ لیتا ہے۔''

(تلاش و توازن ڈاکٹر قمر رئیس سن اشاعت 1968، ص:67)

مذکورہ اقتباس کی سطور سے بھی کہیں نہ کہیں یہ بات سامنے آتی ہے کہ صالحہ عابد حسین کی وسعت نظر اس معاملے میں ان کی بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہی ماحول پیش کیا۔ جیسی زندگی ہم جیتے ہیں ویسی ہی حیات کا نقشہ پیش کیا ہے اور جو کردار اس دنیا میں ملتے ہیں وہی کردار پیش کیے ہیں۔

''راہِ عمل'' صالحہ عابد حسین کا چوتھا ناول ہے۔ اس ناول میں ہندوستان او راس کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس ناول میں ایک چھوٹے سے گاؤں کمل نگر کا ذکر کیا گیا ہے، جہاں پرانے خیالات رکھنے والے ہندو مسلمان، زمیندار اور کسان آباد ہیں۔ وہاں ایک سیاسی رہنما جو حبیب جاں کے نام سے مشہور ہے وہ گاؤں کی ترقی کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔ اس کے دل میں قوم کے لیے سچی محبت او رایثار کا جذبہ ہے۔ وہ عورت کی آزادی کا بھی حامی ہے وہ گاؤں کی ترقی کے لیے بہت کوشش کر کے حکومتی سطح سے مدد بھی حاصل کرلیتا ہے۔

صالحہ عابد حسین نے کمل نگر گاؤں کو اپنی فنی صلاحیتوں سے بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ گاؤں والوں کا الگ الگ لہجہ ان کے مزاج کی سادگی، زمیندارانہ خیال اور ان کے افق سے طلوع ہوتے ہوئے ہندوستان کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہیں۔ اس ناول کے بھی سبھی کردار جاندار اور منھ سے بولتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مصنفہ نے ہر کردار کو ابھرنے کا موقع دیا ہے۔ اس لیے سکینہ بیگم، ندیم، خالدہ، گیتا، مونی بیگم، حبیب جاں، صفیہ بیگم وغیرہ اپنے اندر بڑا گہرا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس ناول کا کینوس وسیع نظر آتا ہے۔ راہ عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر احمد فاروقی رقم طراز ہیں:

''صالحہ عابد حسین کے یہاں گہرائی اور توازن کم ہے۔ وہ ناول کے ارتقا کے نشیب و فراز اور اس کی موجودہ منزل سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔ انھوں نے باطن میں اترنے اور لاشعور کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی محبت میں وہ گرمی نہیں ہے جو مرد و عورت کے فطری خیالات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس پر رومانیت اور تقدس کا سایہ ہے۔''

(کتاب نما-29، سن اشاعت جون 1964، راہ عمل صالحہ عابد حسین، طبع اول 1963)

صالحہ عابد حسین کے دوسرے ناولوں کی طرح ''یادوں کے چراغ'' میں بھی شادی شدہ لڑکی کے ساتھ شوہر کی بے وفائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ ناول ایک بچے کے وجود میں آنے سے شروع ہوتا ہے جو انسان کے دکھوں کی شروعات ہے اور ناول کا خاتمہ موت پر ہوتا ہے جو انسان کے دکھوں کی انتہا ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے کنول کے کردار کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں ایسی خوددار اور اپنی حیثیت کو پہچاننے اور سماج میں خود کو منوانے والی عورتیں اس دور میں بھی موجود ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار کنول ہے، جس کے والدین شادیاں کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود اس کی ماں شوہر پرستی کا ثبوت دیتی نظر آتی ہے۔ جس کو دیکھ کر کنول بہت پریشان رہتی ہے۔ شوہر کی اس بے وفائی کے بعد بھی اس کی ماں کیسے اسے اپنا مجازی خدا تصور کرسکتی ہے کیوں کہ وہ نئے زمانے کی لڑکی ہے۔ وہ اپنی انسانی جبلت منوانا بہت اچھی طرح سے جانتی ہے۔ اس لیے جب اس کی شادی احمد نام کے ایک شخص کے ساتھ طے ہوجاتی ہے تو وہ شادی سے پہلے اس بات سے آگاہ کردیتی ہے کہ وہ اس کی بے وفائی کے ساتھ رشتہ آگے نہیں لے جائے گی۔ وہ جس طرح سے اپنے ہونے والے شوہر سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے تو احمد بھی اس کے سخت لہجے سے متاثر ہوکر اس کے معیار پر پورا اترنے کا ارادہ کرتا ہے۔ کچھ دن بعد احمد بھی منع کردیتا ہے اور دوسری لڑکیوں سے دوستی بڑھاتا ہے۔ جب کنول کو اس کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو وہ عام لڑکیوں کی طرح رو کر اپنے پاس واپس نہیں بلاتی بلکہ اسے پوری طرح چھوڑنے کا ارادہ کرلیتی ہے:

''اماں تمھاری طرح میرے دور میں بھی بے وفائی کا داغ اٹھانا سیکھا تھا، اماں میرا دل تمہارا جتنا بڑا نہیں۔ پھر تم پرانی قدروں کی پرستار تھیں، رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی

ہوئی تھیں۔ مگر تمہاری بیٹی نئے زمانے کی عورت ہے، جو اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکتی ہے۔ میں آزاد ہند کی آزاد اور خوددار بیٹی سماج کے جھوٹے بندھنوں اور رواج کے گھناؤنے اصولوں کی پابندی نہیں کرسکتی۔ یہ دھوکے کی زندگی یہ ظاہرداری کا ڈھونگ نہیں رچاسکتی۔''

(صالحہ عابد حسین، یادوں کا چراغ، سن اشاعت 1980، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ص:388)

مذکورہ اقتباس کی سطور سے صالحہ عابد حسین مسلم متوسط طبقے کی ان عورتوں کو کنول کے کردار سے یہ بتانا چاہتی ہیں کہ اگر وہ اپنی اہمیت خودداری اور عزت نفس کو اس معاشرے میں برقرار رکھنا چاہتی ہیں تو انھیں مضبوطی سے آگے بڑھنا ہوگا۔

کنول نئے زمانے کی تعلیم یافتہ عورت ہے۔ لہٰذا وہ اپنی انا او راپنی انسانی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے احمد اور اس کی محبوبہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاتی ہے۔ کنول کے اندر کی مشرقی عورت یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ اپنے دل میں جس شخص کو دیوتا کی جگہ پر بٹھا چکی ہے اس کی جگہ کسی اور کو بٹھائے۔ اس لیے جب وہ احمد سے رشتہ توڑ کر اپنے بھائی کے گھر آتی ہے تو دوبارہ شادی کرنے سے انکار کردیتی ہے۔

صالحہ عابد حسین کے زیادہ تر ناولوں میں مسلم معاشرے کے متوسط طبقے کی عورتوں کی ازدواجی زندگی کے مسائل سے پردہ اٹھانے کی کاوشیں ملتی ہیں۔

مذکورہ ناول کا پلاٹ نہایت ہی مربوط ہے۔ جس میں کنول کا کردار اس طرح پیش کیا گیا ہے میں خوبیاں، خامیاں، خوشیاں، محرومیاں سب موجود ہیں۔ اس ناول کی خصوصیات دردناک لہجہ اور اس کی نم انگیزی ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک درد وغم کی لہروں کا منظر نامہ ملتا ہے۔

ناول ''اپنی اپنی صلیب'' بھی صالحہ عابد حسین کے اہم ناولوں میں سے ہے، جو 2013 میں شائع ہوا۔ اس ناول کی شروعات کچھ نئے انداز سے ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ناول کے شروع میں وہ دلچسپی دیکھنے کو نہیں ملتی جو صالحہ عابد حسین کے ناولوں کی خصوصیات ہے لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے ناول کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس ناول میں درمیانی درجہ کے مسلم جاگیردارانہ خاندان کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ کہانی میں چار کردار خاص ہیں: علی اصغر، زہرا، حمرا اور رضوانہ۔ یہ چاروں ایک ہی ماحول کی پیداوار ہیں۔ ان کا رہن سہن، تہذیب اور سوچ ایک جیسی ہے کیونکہ ان کا بچپن ایک ساتھ گزرا ہے، اس لیے بہت سی باتیں ان میں مشترک ہیں۔ ناول علی اصغر کی بیماری سے شروع ہوکر اس کی موت پر ختم ہوتا ہے اور اس تھوڑے سے عرصے میں پوری زندگی کی تصویر پیش کردینا صالحہ عابد حسین کی فنی لیاقتوں کا کمال ہے۔ ناول کے آخر میں علی اصغر کی وفات کے بعد زہرا اور حمرا دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین نے اس ناول میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ناول کا پلاٹ سیدھا سادا ہے، سبھی کردار اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اگرچہ اس ناول کی رفتار بہت دھیمی ہے لیکن زبان وبیان کی دلکشی اس کے عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ چونکہ زبان خوبصورت ہے اس وجہ سے ان کے جملے بہت مربوط ہیں۔ بعض جملوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری کے دل ودماغ میں پیوست ہوگئے ہوں۔ ناول کے اسلوب نگارش کی دلکشی کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری، جزئیات نگاری کے سحر سے بھی اسے اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

''الجھی ڈور'' بھی صالحہ عابد حسین کا اہم ناول ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی فکر کی تمام تر رنگینیاں سمودی ہیں۔ ہمارا سماج جس بحرانی کیفیت سے دوچار ہے انسان جن پریشانیوں اور الجھنوں کا شکار ہے اس کا بیان اس ناول میں بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ یہ ایک جیتی جاگتی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

''انش خاموش'' کے بعد یہ صالحہ عابد حسین کا دوسرا اہم ناول ہے، جس میں ازدواجی زندگی میں ایک عورت کے بیوی اور ماں بننے کے بعد جو مسائل پیش آتے ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک تعلیم یافتہ لڑکی کا ہے جو اسکول میں ٹیچر ہے، اس کی بچی معذور ہے، اس لیے وہ سسرال میں ہو رہے ظلم وستم کو برداشت کرنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھتی ہے۔ اس کے شوہر کا نازی نام کی عورت کے ساتھ تعلق ہوتا ہے وہ شوہر پرست ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود کو بدل دیتی ہے مگر اس کو دکھ درد کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آسیہ کو اتنی محبت اور خدمت کرنے کے بعد جب شوہر کی طرف سے بے وفائی ملتی ہے تو وہ اپنی بیٹی کو لے کر اپنے شوہر کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔

یہ ناول ایک عورت کی زندگی میں پیش آرہی مشکلات اور مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ دیر سے ہی سہی لیکن آسیہ اپنی عزت نفس کے لیے سماج کی سبھی روایت سے اختلاف کرکے اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور مصنفہ کی اس سوچ کے مطابق قدم اٹھاتی ہے کہ:

''عورت بھی انسان ہے اسے بھی جینے کا حق ہے عزت کروانے کا بھی حق ہے۔''

(صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، سن اشاعت 1982، جامعہ نگر، دہلی، ص:65)

اس ناول میں موجودہ دور کی عکاسی کر کے زندگی کا صحیح رخ پیش کیا گیا ہے، جس طرح قدیم تہذیب مٹ رہی ہے اس کی جگہ نئی تہذیب پروان چڑھ رہی ہے جس کی سچی تصویر اس ناول میں بہترین طریقے سے پیش کی گئی ہے۔

اس ناول کے اہم کردار آسیہ، گڑی بی بی بیگم وغیرہ ہیں۔ ہر کردار اپنی اپنی جگہ اہم ہے۔ صالحہ عابد حسین نے اس ناول میں حقیقت نگاری، کردار نگاری اور جذبات نگاری کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ اس ناول کی ترتیب وتکنیک کے لیے خود انھوں نے لکھا ہے:

> ''ہوسکتا ہے ناول کی ترتیب وترتیب کی تکنیک کچھ اور ہوتی ہو مگر میں تکنیک کی غلام کبھی نہیں بنی جو بات میں عام طور پر پھیلا کر چار سو صفحات میں کہتی وہ میں نے سمیٹ کر ڈیڑھ سو صفحوں میں کہہ دی ہے۔''

''ساتواں رنگ'' بھی صالحہ عابد حسین کا ایک ایسا ناول ہے، جس میں انھوں نے ازدواجی زندگی میں عورت کو جو مسائل پیش آتے ہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ جن میں خاص کر دو اہم مسائل پر خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے، ایک تو لڑکی کی بنا مرضی کے شادی اور اس کی کم عمر میں شادی۔ یہاں مصنفہ نے والدین پر طنز کیا ہے کہ لڑکی کی پیدائش کے بعد اسے ایک ہی بات یاد دلائی جاتی ہے کہ اسے پرائے گھر جانا ہے، اس کی تعلیم پر بھی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور جب والدین اس کی شادی کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کی مرضی پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھتے اور اس کی شادی طے کر دیتے ہیں۔ بنا یہ سوچے کہ ان کے اس فیصلے سے ان کی بیٹی خوش ہے یا نہیں۔ ناول کا مرکزی کردار زیبی ہے جب اس کی شادی کی خبر اس کے کانوں تک پہنچتی ہے تو وہ اپنی بے بسی اور مجبوری کا حال اپنی دوست عزیزہ کو خط میں لکھتی ہے، جس میں مرضی کے خلاف شادی کے متعلق نہ صرف زیبی کے بلکہ پورے طبقہ نسواں کی ذہنی کیفیت کو اجاگر کر دیتی ہے۔

دوسری طرف مصنفہ نے اس ناول میں خواتین سے جڑے ایک اور مسئلے پر سماج کے باشعور افراد کی توجہ دلانے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ سماج میں عورت سے ہی کیوں قربانیاں مانگی جاتی ہیں۔ ہمیشہ اس کو ہی سسرال اور شوہر کی بات ماننے کا مشورہ کیوں دیا جاتا ہے۔ یہ توقع مرد سے کیوں نہیں کی جاتی۔ عورت کی ناانصافی کرنے پر شادی کا رشتہ کیوں ختم ہوجاتا ہے۔ ہر حال میں سمجھوتا عورت کے حصہ میں ہی کیوں آتا ہے۔ اس ناول میں زیبی کے والدین اپنے افراد کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں جو شادی کے وقت بھی بیٹی سے ہی سمجھوتے کی تلقین کرتے ہیں۔

''گوری سووے سیج پر'' بھی ایک رومانی ناول ہے۔ ناول کا مرکزی کردار مہر و ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس ناول میں اس کی شادی سے لے کر موت تک کے واقعات کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مہر و سیدھی سادی اور گھریلو لڑکی ہے اس کی شادی سہیل سے ہوتی ہے۔ سہیل، نسیم نامی لڑکی سے پہلے ہی محبت کرتا ہے لیکن وہ اپنی ماں کی خواہش کے آگے ہار جاتا ہے اور مہرو سے شادی کر لیتا ہے۔ مہرو ایک وفادار اور شوہر پرست لڑکی ہے، اس کی وفاداری سہیل کے دل سے نسیم کی محبت نکال دیتی ہے۔ جب مہرو کا انتقال ہوجاتا ہے تو سہیل اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور گزری ہوئی باتوں کو یاد کرتا ہے۔

اس ناول کے پلاٹ میں مہرو کی بے چینی اور بے قراری بکھری ہوئی ہے۔ شوہر پرستی اور وفاداری ہندوستانی عورت کے طور طریقہ کی طرف بھی نشاندہی کرتی ہے۔ مہرو شوہر کی تعظیم کو اپنا مذہب سمجھتی ہے اور نسیم سے اس کے شوہر کے تعلقات کا علم اس کے جذبات اور خیالات میں ہلچل پیدا کرتا رہتا ہے۔

اس ناول میں صالحہ عابد حسین نے ایک عام گھرانے کی بھرپور مرقع کشی کی ہے۔ ناول میں سبھی کردار اہم ہیں۔ نسیم، غزالی، نازش، عالیہ، ثریا وغیرہ کے کردار بہت اہم ہیں۔ مہرو کے کردار میں جو حرارت ہے وہ پلاٹ کی خوبصورتی بڑھاتی ہے۔ اس ناول میں بہت زیادہ اور متحرک کردار نہیں ہیں لیکن پھر بھی یہ ناول کامیاب ترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مختصر طور پر صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ صالحہ عابد حسین نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں جہاں سماجی سطح پر طبقۂ نسواں کے مسائل اور ان کے حقوق کی پامالیوں کو موضوع بحث بنایا ہے وہیں ان کے حل کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کی سب سے اہم خوبی یہی ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کا تانا بانا اپنے اردگرد کے مسائل سے ہی بنا ہے۔ یہی ایک بہترین فنکار کی فنی صلاحت اور خوبی تسلیم کی جاتی ہے۔

□□□

Umme Jozi
Department of Urdu
Aligarh Muslim Universty (AMU)
Aligarh-202001 (U.P)
Mob- 9675740930
joziumme@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

زلف سے پوچھو پریشانی مری
اور آئینہ سے حیرانی میری
راضیہ خاتون جمیلہ

نہ پہنچی اسے گرمیٔ آفتاب
جلانے کو ہر ذرہ تیار ہے
نثار فاطمہ کبریٰ

شکوے گلے کیے نہ فغاں کی نہ آہ کی
کیوں کر اڑی خبر مرے حال تباہ کی
ز۔خ۔ش

دیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ
شیشۂ چشم میں شراب کا رنگ
رابعہ پنہاں

مرے تصور حدودِ گماں سے بالاتر
ترا وہ 'فضل' کہ جس کا کبھی قیاس نہ ہو
انیسہ بیگم شروانی

کیا گزرتی ہے فلک پر دیکھیے
آج کچھ اچھا نہیں ہے دل کا رنگ
محمودہ خاتون محمودہ

کسی کی بزم میں مڑ مڑ کے نقش پا نہ دیکھ
مہ و ستارہ کی شانِ خرام پیدا کر
زیب عثمانیہ

بشیر اب گردش شام و سحر کی یاد باقی ہے
کہاں تک ساتھ دے سکتے زمین و آسماں اپنا
بشیر النساء بیگم بشیر

گلشن ترے بغیر نہ صحرا ترے بغیر
اس عشق نے کہیں کا نہ رکھا ترے بغیر
صالحہ بیگم مخفی

شوق کہتا ہے کہ چلیے کوئے جاناں کی طرف
چاہیے وارفتگی کی پاسداری ان دنوں
حیا لکھنوی

ہوتا ہے درد عشق سے گر لذت آشنا
دل کو خراب تلخیٔ ہجراں تو کیجیے
صفیہ شمیم

میں نے گھر تک جلا کے دیکھ لیا
ان کے گھر تک ہی روشنی نہ گئی
رابعہ سلطانہ ناشاد

جنھیں حوادث عالم سکھائے بخیہ گری
وہ اپنا چاک گریباں بھی خود ہی سیتے ہیں
سعیدہ عروج مظہر

توبہ کے ہیں کچھ پھول تو کچھ اشک ندامت
سوغات لیے بیٹھی ہوں آتے ہی نہیں وہ
بیگم رضیہ حلیم جنگ

لو کے موسم میں بھی دل انداز صبا کا چاہیے
بات جس تس سے کرے ذکر تمھارا چاہیے
ادا جعفری

یوں قدم پر پہ ٹھوکریں ملتی رہیں مگر
ہم زندگی کو خواب پریشاں نہ کر سکے
زبیدہ تحسین

(نسائی شعری آفاق، کہکشاں تبسم، سنہ اشاعت 2015، تاج آفسیٹ پریس، پٹنہ)

ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ

ڈیجیٹل بچے

گرمیوں کی چھٹیاں قریب آ گئی تھیں اسماء نے اپنے شوہر ریحان سے کہا کہ بیٹی کے پاس امریکہ جانا ہے ایئر لائنز کے ٹکٹ بک کرا دیں بیٹی ہانیہ روز ہی فون کر کے پوچھتی ہے ''امی ابو آپ لوگ امریکہ کب ارہے ہیں ریحان نے اسماء کے کہنے پر امریکہ کے لیے ٹکٹ بک کرا دیے۔ اسماء اور ریحان نے بیٹی کے بچوں کے لیے طرح طرح کے انڈین ڈریس اور کھلونے وغیرہ خریدنے شروع کر دیے تیاری تقریباً مکمل ہو چکی تھی فلائٹ والے دن ٹیکسی سے دہلی ایئر پورٹ پہنچے ہوائی جہاز سے ایک لمبا سفر طے کر کے بچوں سے ملنے کی خوشی میں امریکہ پہنچے، دونوں جب سامان اٹھا کر باہر نکلے تو بیٹی اور داماد ایئر پورٹ پر لینے آئے ہوئے تھے۔ خوشی خوشی کار میں بیٹھ کر گھر کے لیے روانہ ہو گئے تھکن کی وجہ سے دونوں کمرے میں جا کر سو گئے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اٹھے اور اٹیچی کھول کر بچوں کے لیے خریدے ہوئے گفٹ اور کھلونے نکالنے لگے بیٹی ہانیہ کے بیٹے ایان اور ایرا کو دونوں نے اپنے پاس بلایا اسماء کہنے لگی بچوں یہ انڈیا سے تمہارے نانا نانی الیکٹریکل کار، ناچنے والا بھالو گڑیا اور کچھ انڈین ڈریس لے کر ائے ہیں کیونکہ ویسٹرن ڈریس تو تم لوگ یہاں سے لے لیتے ہو اور بتاؤ ذرا کہ کیسے لگ رہے ہیں بچے خوشی خوشی اپنے کھلونے چلا کر دیکھنے لگے نانی اچھے ہیں، تھوڑی دیر بعد بچوں کا کھلونوں سے دل بھر گیا اور بچے کھلونے وہیں چھوڑ کر اپنے کمروں میں چلے گئے اسماء اور ریحان کو صبح سویرے ہی سو کر اٹھنے کی عادت تھی صبح ہوئی تو اسماء اٹھ کر کچن میں ناشتہ بنانے چلی گئی اور ریحان نہانے ناشتے کے بعد دونوں لونگ روم میں اگئے جہاں دیوار پر بڑا سا ٹی وی لگا ہوا تھا بچوں کا ٹائم ٹیبل بنا ہوا تھا بچوں کو اٹھانے اور اسکول بھیجنے کے لیے ہانیہ نے الارم لگا دیا تھا جیسے ہی الارم بجا بچے بستر سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے چلے گئے ہانیہ نے ناشتہ تیار کر کے بچوں کو ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیا بچے ناشتے میں آنا کانی کر رہے تھے ہانیہ بولی چلو میں ٹی وی پر تمہارا پسندیدہ کارٹون چلا رہی ہوں چلو جلدی ناشتہ کر لو بس آنے والی ہے۔ بچے کارٹون دیکھتے ہی خوش ہو کر ناشتہ کرنا شروع کر دیتے ہیں ناشتہ کرانے کے بعد ہانیہ بچوں کو بس پر چھوڑنے چلی جاتی ہے۔ دوپہر میں بچے اسکول سے اگئے ہانیہ اتنی دیر میں گھر کے کام کاج نپٹانے لگی، اسماء بھی کھانا بنانے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی ہانیہ گروسری کرنے کے لیے گاڑی اٹھا کر اسٹور چلی جاتی ہے اور وہاں سے بہت ساری چیزیں لے کر کے واپس آتی ہے بچوں کو کھانا کھلانے کے لیے ہانیہ نے اواز دی چلو بچو لنچ ٹائم بچے کھانے میں آنا کانی کرنے لگے ہانیہ پھر بچوں کے لیے ٹی وی میں کچھ گیمز چلا دیتی ہے، یعنی ناشتے سے لے کر کھانے تک ٹی وی گیمز کی رشوت دی جاتی ہے گوگل اسسٹنٹ لگا کر ٹائم فکس کر دیا جاتا ہے دس منٹ کا الارم لگا دیا جاتا ہے ہانیہ گوگل اسسٹنٹ سے کہتی ہے گوگل سیٹ ٹائم فار 10 منٹ جیسے ہی دس منٹ کا ٹائم پورا ہوتا ہے گوگل بیل بجانا شروع کر دیتا ہے بچے ٹی وی میں اپنا من پسند گیم دیکھ کر کھانا کھا رہے ہیں بیل بجنے پر ٹی وی پر سیٹ گیم کارٹون رک جاتا ہے کھانا ختم ہو چکا ہے اب بچوں کا پلے ٹائم شروع ہوتا ہے گھر کے سامنے پارک ہے بچے پارک میں کھیلنے چلے جاتے ہیں کچھ دیر بعد ہانیہ بچوں کو پارک سے لینے پہنچ جاتی ہے چلو بچو پلے ٹائم فنش بچے ماں کے پیچھے گھر کی طرف چل پڑتے ہیں ہانیہ انھیں اسکول میں ملے ہوم ورک کے لیے بٹھا دیتی ہے جب بچے ہوم ورک کر لیتے ہیں تو بچے کہتے ہیں مما ہمیں آئی پیڈ دے دیں ہمیں اس میں گیمز

کھیلنے ہیں ہانیہ دونوں کو الگ الگ آئی پیڈ دے دیتی ہے اسماء ریحان سے کہنے لگی دیکھو ایک ہمارا بچپن تھا پڑھائی کے بعد ہم محلے کے بچوں کے ساتھ چھم چھپیا کیرم بورڈ لوڈو اکڑ بکڑ بمبے بو اتنا کثری وغیرہ کھیل کھیلتے تھے جہاں ان کھیلوں سے جسمانی ورزش ہوتی تھی وہیں آنکھوں پر بھی چشمے نہیں لگتے تھے اب تو ہر وقت بچے آئی پیڈ ٹی وی کارٹون گیمز یوٹیوب انسٹاگرام پر نظریں گڑائے رہتے ہیں آج کی نسل کے ذہن و دماغ پر سوشل میڈیا جنون کی حد تک حاوی ہو چکا ہے بچے سوشل میڈیا کے حصار میں ہیں اس نسل کی تربیت بزرگوں نے نہیں سوشل میڈیا نے کی ہے، آج کے بچے روبوٹ بن گئے ہیں بچپن میں ہی آنکھوں پر چشمے لگ گئے ہیں ہر وقت انٹرنیٹ سے جڑے رہتے ہیں نانا نانی بات کرنا چاہتے ہیں مگر بچوں کو کہاں فرصت سارا دن اپنی انٹرنیٹ کی دنیا میں مست بچے، اسماء کو اپنی بچپن کی یادیں تازہ ہونے لگیں وہ ریحان کو بتانے لگی بچپن میں امی صبح سویرے ہم سب بہن بھائیوں کو اٹھا دیتیں ہم لوگ فجر کی نماز پڑھتے پھر پڑھنے بیٹھ جاتے ناشتہ کر کے اسکول چلے جاتے وہاں سے آکر دوپہر میں ارام کرتے شام میں کھیل کا ٹائم ہو جاتا محلے کے بچے اکٹھے ہو جاتے اور خوب دھما چوکڑی مچاتے محلے سے پڑوسی یا کوئی رشتہ دار آجاتے تو امی ہمیں بلاتیں انھیں سلام کرو تھوڑی دیر پاس بیٹھو پھر پڑھنے بیٹھنا ہم سب بہن بھائی سلام کر کے تھوڑی دیر اپنے رشتہ داروں یا پڑوسیوں کے پاس بیٹھتے باتیں کرتے پھر پڑھنے بیٹھ جاتے امی ابو کا سخت آرڈر تھا کہ ہر رشتہ دار کو سلام کرنا ہے اور ملنا جلنا ضروری ہے مگر اب ہمارے گھر کوئی بھی آتا ہے بچے اپنے کمرے سے باہر نکلنا نہیں چاہتے ان کی اپنی دنیا ہے۔ ڈیجیٹل اور ورچول دنیا ہمارے زمانے میں یہ سب کہاں ہوتا تھا ہمارا اردو سیکھنا ضروری تھا جو مولوی صاحب قرآن پڑھانے آتے وہی اردو بھی پڑھاتے تھے اور تختی پر اردو لکھواتے تھے اور غلط لکھنے پر کان بھی مروڑتے تھے اب اسماء دیکھ رہی تھی کہ دونوں بچوں کو پاکستان سے کوئی عالمہ آن لائن قرآن پڑھا رہی ہیں پہلے وہ بچوں کو کال کرتی ہیں کبھی بچے کال اٹھا لیتے ہیں یا پھر ہانیہ کال ریسیو کر کے بچوں کو دے دیتی ہے اور وہ 20 منٹ قرآن پڑھا کر چلی جاتی ہیں بچے گھر کے باہر لگے باکس میں برانڈڈ کمپنیوں کے فلائرز آجاتے ہیں بچے بڑوں سے زیادہ ان فلائرز کو پڑھ کر ماں باپ کو تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں دیکھیں مما میں لیوس کمپنی کی جینز لوں گی اور یہ سیل میں ائی ہوئی ہے بیٹا کہتا ہے کہ یہ Reebok کے یا Adidas کے شوز سب کتنے خوبصورت ہیں اور کتنے سستے سیل میں آئے ہوئے ہیں۔ میں مما یہ لوں گا اپ کب چلیں گی مال مجھے دلوانے کے لیے اور اسماء سوچ رہی ہے کہ اس صارفین زدہ کلچر میں کیسے بچوں اور بڑوں کے دماغوں کو ملٹی نیشنل کمپنی نے کیپچر کر لیا ہے اور جب تک وہ لوگ شاپنگ نہ کریں برانڈڈ کپڑوں اور جوتوں کی تب تک انھیں لگتا ہے کہ ان کی زندگی ادھوری ہے سوشل میڈیا ان کے دماغ پر حاوی ہو چکا ہے بچے سوشل میڈیا کے حصار میں جی رہے ہیں ریحان اسماء کی بات سنتے رہے پھر بولے وقت بہت تیزی سے بدل رہا ہے اب 21 ویں صدی ہے اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اب کے بچپن اور 60 سال کے پیچھے بچپن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اب سب وہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں زندگی میں ٹیکنالوجی نے انسان کی جگہ لے لی ہے اب کیا بچہ اور کیا بڑا سب موبائل سے ہی باتیں کرتے ہیں اور یہاں تک کہ ہنسنا اور مسکرانا سب موبائل سے ہی چلتا ہے اس میں اسی طرح کی دخل اندازی نہ تو بچوں کو پسند ہے نہ بڑوں کو اب ہمارا زمانہ تو گیا زمانے کے رسم و رواج رہنا سہنا تعلقات رشتے ناطے ان سب چیزوں پر ٹیکنالوجی حاوی ہو چکی ہے۔ ہانیہ بچوں سے کہتی ہے چلو ایان ایرا نانا نانی کے پاس بیٹھو تھوڑی دیر ان سے باتیں کرو ان سے کہانیاں سنو دونوں بچے اپنے آئی پیڈ سے نظر اٹھا کر ماں کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے انھوں نے کوئی بہت مشکل بات کہہ دی ہو بچے تھوڑی دیر نانا نانی کے پاس بیٹھ کر پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ نانا نانی خوب سمجھ رہے ہیں کہ بچے بے دلی سے ان کے پاس بیٹھے ہیں اسماء سوچ رہی تھی کہ جب ہمارے اسکول کی چھٹیاں ہونے والی ہوتی تھی تو ہم ایک مہینہ پہلے سے نانا نانی کے گھر جانے کی تیاری شروع کر دیتے تھے اتنا ایکسائٹمنٹ ہوتا تھا کہ کب چھٹیاں ہوں گی اور کب ہم ریل میں بیٹھ کر نہال جائیں گے جب ہم وہاں پہنچتے تھے تو نانا نانی استقبال میں بچھے جاتے۔ نانی ہمیں گود میں بیٹھا کر سبق آموز کہانیاں سناتیں جن کا ہمارے دل پر گہرا اثر ہوتا ان کہانیوں میں سیکھ بھی ہوتی، انڈیا واپسی کے دن قریب آرہے تھے اسماء نے اٹیچی میں کپڑے رکھتے ہوئے ایان سے پوچھا بیٹا انڈیا چلو گے ایان نے جواب دیا نہیں ہم لوگ ٹی وی پر دیکھتے ہیں انڈیا میں جھگی جھونپڑی وغیرہ ہیں اور وہاں لوگ بیمار ہوتے ہیں تو انھیں ٹھیک سے علاج نہیں ملتا خاص طور سے غریب کو اف اس ٹیکنالوجی نے تو دنیا کے سامنے سارے سچ اجاگر کر دیے ہیں ڈیجیٹل بچے اپنی ورچول دنیا میں مصروف ہیں ریحان اسماء سے کہتے ہیں بچوں کو اب نہ نانا نانی کی کہانی چاہیے نہ ان کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا نہ ان کے ساتھ کچھ سیکھنا۔ سچ ہے ٹیکنالوجی نے رشتوں کے لمس اور مٹھاس کو ختم کر دیا ہے فلائٹ کا ٹائم ہو چکا ہے

Dr. Qudsia Anjum Alig
70/11,Pakka Bagh
Saharanpur-247001 (U.P)
9837378699/8218902778
anjumqudsia14gmail.com

شاہ تاج خان

Haemophilia
رشتے

زبیدہ خالہ بہت پریشان سی اپنی سہیلی میمونہ کے پاس پہنچیں اور شکایت بھرے انداز میں کہنے لگیں۔

''اب ہم بوڑھے لوگوں کی بات کوئی نہیں سنتا۔ایک زمانہ تھا کہ منہ سے بات نکلی اور سب سر جھکا کر مان لیا کرتے تھے۔کوئی سوال تو دور کی بات کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔مگر یہ آج کل کے بچے تو اپنے ماں باپ کی ہی نہیں سنتے تو ہماری بات کیا سنیں گے۔زمانہ بہت برا آ گیا ہے۔'' زبیدہ خالہ نے تخت پر میمونہ کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنی شکایتوں کا پٹارہ کھول دیا۔میمونہ نے مسکرا کر زبیدہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیا ہو گیا اتنا غصّہ کیوں ہو؟ یہ لو پہلے ایک گلاس پانی پیو اور اپنا غصّہ ٹھنڈا کرو۔'' حالانکہ زبیدہ اور میمونہ کا آپس میں کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے مگر وہ ایک جان دو قالب ہیں۔برسوں پہلے جب شعیب کی دلہن بن کر زبیدہ خالہ نور منزل میں آئیں تو انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے میمونہ بی دروازے پر موجود تھیں۔میمونہ بی نور منزل میں حبیب کی دلہن بن کر ایک سال پہلے ہی آئی تھیں۔دو منزلہ نور منزل کی پہلی منزل پر زبیدہ بیگم اور دوسری منزل پر میمونہ بی نے اپنی اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک دونوں پڑوسنوں کی دوستی کو اب ساٹھ سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔بچوں کی شادی ہو چکی ہے اور اب تو پوتا پوتی بھی شادی کے لائق ہو چکے ہیں۔میمونہ بی کو اب سیڑھیاں چڑھنے اترنے میں دقت ہوتی ہے۔اِس لیے زبیدہ خالہ ہی اپنی سہیلی کے پاس چلی آتی ہیں۔میمونہ بی کا سوال سن کر زبیدہ خالہ نے کہا۔

''کیا بتاؤں میمونہ! تم تو جانتی ہو کہ خیر سے سنبل اب شادی کے لائق ہو گئی ہے۔اور راحیل بھی اپنا بزنس اچھی طرح سنبھال رہا ہے۔میرے ذہن میں دونوں بچوں کی شادی کرنے کا خیال آیا تو میں نے اپنی دونوں بہوؤں سے بات کی۔'' میمونہ بی نے درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

''کیا دونوں بہوؤں کو تمہاری بات پسند نہیں آئی؟'' زبیدہ خالہ نے کہا۔

''اے ہے! بہوئیں تو کیا بیٹے بھی میری بات سے خوش ہو گئے مگر جب راحیل سے بات کی وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔میرا تو خون کھول گیا۔میں نے چپل پہنی اور تمہارے پاس چلی آئی۔'' میمونہ بی نے کہا۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ہوں ں ں! راحیل کے انکار کی وجہ معلوم کرنا ضروری ہے۔ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت سمجھدار ہے۔'' زبیدہ خالہ نے کہا

''میں نے اپنے دونوں بیٹوں کے لیے جو اپنی چھوٹی بہن کی دونوں بیٹیوں کا انتخاب کیا تھا تو کیا وہ غلط تھا؟ دیکھو دیورانی جٹھانی کتنی اچھی طرح سے رہتی ہیں۔اگر میں کہیں باہر سے بہوئیں لاتی تو کیا سب ایک ہی چھت کے نیچے اتنے پیار اور محبت سے رہ پاتے؟'' میمونہ بی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا۔میں خود گواہ ہوں کہ دونوں بہوؤں نے گھر کو جنت بنا دیا۔وہ دونوں تو ہمیشہ بہنوں کی طرح ہی رہتی ہیں۔'' زبیدہ خالہ نے میمونہ بی سے کہا۔

''تم تو جانتی ہو کہ چھوٹی دلہن کی اکلوتی اولاد سنبل کتنی نازوں سے پلی بڑھی ہے۔کیا کوئی اور اس کا اتنا خیال رکھ پائے گا؟ بچی گھر کے گھر میں ہی رہے گی۔وہ بھی میری آنکھوں کے سامنے۔'' میمونہ بی نے کہا۔

''ہاں! چھوٹی دلہن کے تین تین بچے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔کتنی دعاؤں، منتوں کے بعد سنبل پیدا ہوئی تھی۔پیدا ہوتے ہی جب اس کے رونے کی آواز گونجی تھی وہ آواز مجھے آج بھی سنائی دیتی ہے۔ہم سب خوشی کے مارے رو پڑے تھے۔روئی کے گالوں کی طرح اسے ہاتھوں میں رکھا۔آئے دن ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا تھا۔بہت مشکل وقت تھا۔'' زبیدہ خالہ نے مسکراتے ہوئے اپنی آنکھ میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! تم تو جانتی ہو کہ ماہواری کے دوران سنبل کی حالت کتنی خراب ہو جاتی ہے۔کیا کوئی دوسرا اس کی تکلیف کو سمجھ سکے گا۔'' میمونہ بی

نے فوراً کہا۔

''اے ہے زبیدہ! کسی دوسرے سے یہ امید بے کار ہے۔'' کافی دیر تک دونوں سہیلیاں سر جوڑے بیٹھی رہیں۔ آخر میں میمونہ بی نے کہا۔

''زبیدہ! ایک کام کرو۔ جب شام کو راحیل گھر واپس آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔ کہہ دینا کہ بی دادی نے بلایا ہے۔ معلوم تو ہو کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ ضرورت ہوئی تو پھر سنبل سے بھی بات کریں گے۔'' میمونہ بی کی بات سن کر زبیدہ خالہ نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ اب تم ہی کچھ کر سکتی ہو۔ کسی بھی طرح اس سے اپنی بات منوانا ہے۔'' میمونہ بی نے مسکرا کر کہا۔

''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی۔'' زبیدہ خالہ نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! جا کر دیکھتی ہوں کہ گھر میں کیا حال ہے۔ مگر میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔ چپ چاپ سے اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ جاؤں گی۔ تا کہ بہوؤں کو بھی لگے کہ میں ناراض ہوں۔'' شام کو جب راحیل گھر آیا اور دادی کو سلام کیا تو زبیدہ خالہ نے صرف اس کے سلام کا جواب دیا اور کہا۔

''تمھیں بی دادی نے بلایا ہے۔ ان سے ابھی جا کر مل لو۔'' راحیل نے بھی بنا کچھ کہے سیدھا بی دادی کے پاس جانا ہی بہتر سمجھا۔

''بی دادی! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' راحیل نے دروازے میں سے ہی آواز دی

''جی بیٹا! چلے آیئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی ہوں۔'' سلام دعا کے بعد بی دادی نے راحیل سے پوچھا

''کیا تمھیں کوئی اور لڑکی پسند ہے؟''

''نہیں بی دادی! ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ کو بتاتا نا! آپ تو میری دوست ہیں۔''

یہی تو! پھر تم نے سنبل سے شادی کرنے سے انکار کیوں کیا ہے؟'' بی دادی کی بات سن کر راحیل نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ قریبی رشتے داریوں میں اب شادی نہ کی جائے۔ فرحین آپی کو دیکھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔'' میمونہ بی نے کہا۔

''بیٹا! خیر سے وہ اپنے ماموں جان کے گھر میں خوش ہے۔'' راحیل نے شکایت بھرے انداز میں کہا

''ان کے بیٹے کو دیکھا ہے وہ تھیلیسیمیا کا مریض ہے۔ پوری زندگی اسے خون کی ضرورت ہے اور یہ سب قریبی رشتوں میں شادی کرنے کے سبب ہوا ہے۔ بی دادی! چاچی کے بھی تین بچوں کو میں نے قبرستان جاتے دیکھا ہے۔ تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر اب مجھے معلوم ہے کہ ہمیں کیا نہیں کرنا ہے۔''

''راحیل مجھے صاف صاف بتاؤ۔ کیا بات ہے؟'' دادی نے راحیل کو اپنے نزدیک بٹھا کر پوچھا۔

''بی دادی! سنبل اکثر بیمار ہو جاتی ہے۔ تو میں کچھ دن پہلے اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد مجھ سے کہا کہ سنبل کو ہیموٹولوجسٹ (Hemotologist) کے پاس لے کر جاؤ۔ خون کے اسکریننگ ٹیسٹ (screening test) اور کلوٹنگ فیکٹر ٹیسٹ (clotting factor test) کے بعد معلوم ہوا کہ سنبل ہیموفیلیا کیریئر ہے۔'' بی دادی نے حیران ہو کر پوچھا

''اب یہ کیا ہے؟''

''یہ ایک بیماری ہے لیکن پریشان نہ ہوں سنبل صرف کیریئر ہے۔ اسے بہت زیادہ پریشانی نہیں ہے۔ مسئلہ میرے اندر ہے۔'' بی دادی نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا

''اے ہے! اللہ نا کرے کہ میرے بچے کو کوئی مسئلہ ہو۔''

''نہیں بی دادی! میں ہیموفیلیا اے (HA) کا مریض ہوں۔''

''بیٹا اس بیماری کا کوئی علاج تو ہوگا۔ تم نے ڈاکٹر سے بات کی؟'' بی دادی اچانک بہت پریشان ہو گئیں اور راحیل کو اپنے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ راحیل انہیں سمجھانے لگا۔ بی دادی نے سنبھلتے ہوئے کہا

''زبیدہ پریشان ہو رہی ہوگی۔ اسے بھی بلاؤ اور سنبل کو بھی نیچے آنے کے لیے فون کرو۔ باقی باتیں سب کے سامنے ہی کریں گے۔'' راحیل نے سنبل کو فون کیا اور دادی کو ساتھ لے کر بی دادی کے گھر آنے کے لیے کہا۔ دونوں کے آنے پر بی دادی نے کہا۔

''تم دونوں راحیل کی بات دھیان سے سنو۔'' بی دادی نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہاں راحیل! اپنی بات شروع کرو۔'' راحیل نے ہیموفیلیا کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

''ہیموفیلیا ایک موروثی بیماری ہے۔ اسے عام طور پر خون بہنے والی بیماری کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ اس مرض میں جسم میں موجود خون جمانے والے ذرات یا خون جمنے والے عوامل کی کمی ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب اگر کوئی چوٹ یا زخم لگ جائے تو خون رکنے یا جمنے میں کافی دقت ہوتی ہے۔'' زبیدہ خالہ نے راحیل کو درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا

''بے کار کی باتوں میں وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم شادی کے لیے راضی ہو یا نہیں۔'' راحیل کے بجائے میمونہ بی نے کہا۔

''راحیل اس بیماری کا شکار ہے۔'' زبیدہ خالہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیران و پریشان کبھی میمونہ تو کبھی راحیل اور کبھی سنبل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ راحیل نے زبیدہ دادی کو اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''دادی ! پریشان نہ ہوں ۔ مجھے مائلڈ ہیموفیلیا (Mild Hemophilia) ہے۔ یہ بیماری ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ سنبل بھی ہیموفیلیا کیریئر ہے۔ اگر ہم دونوں کی شادی ہوتی ہے تو یہ خطرناک بیماری ہمارے بچوں میں منتقل ہوگی اور میں ایسا بالکل نہیں چاہتا۔ دادی! آپ بھی تو ایسا نہیں چاہیں گی؟ کیا کہتی ہو بی دادی! میں صحیح کہہ رہا ہوں نا!'' بی دادی نے کہا۔

''میرا بچہ ایک دم صحیح کہہ رہا ہے۔'' سنبل خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھی اور اپنے فون پر کچھ پڑھتے ہوئے بولی۔

''اچھا راحیل بھائی! آپ کے خون میں فیکٹر آٹھ کی کمی ہے۔ اور یہاں یہ بھی لکھا ہے کہ انگلینڈ کی رانی کوئین وکٹوریہ ہیموفیلیا بی (HB) کی کیریئر تھیں۔ اسی لیے اس بیماری کو رائل ڈیزیز بھی کہتے ہیں۔''

''ہاں ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ہیموفیلیا بی کے مریضوں میں فیکٹر نو کی کمی ہوتی ہے۔ اور ہاں ڈاکٹر نے ہیموفیلیا کا ایک اور ٹائپ بھی بتایا تھا اس کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا بس یہ یاد ہے کہ اس میں فیکٹر گیارہ کی کمی ہوتی ہے۔ سنبل! میں اکثر ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتا رہتا ہوں اور اس بیماری پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔'' سنبل نے اپنے فون میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''راحیل بھائی! یہاں پر تو چار ٹائپ کا ہیموفیلیا کا ذکر ہے۔ دو تو ہمیں معلوم ہیں اور تیسرا ہے ہیموفیلیا سی ۔ اسے Rosenthal Syndrome یا inherited blood disorder کہتے ہیں اور چوتھے ٹائپ کا نام ہے acquired hemophilia۔'' راحیل نے فوراً کہا

''ہوں ں ں! گوگل سے معلومات حاصل کرنا غلط نہیں ہے مگر اس کی تصدیق ضروری ہے۔ مجھے کہیں سے بھی کچھ معلوم ہوتا ہے تو میں سیدھے ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ میری طبیعت اسی لیے بہتر ہے کہ میں ماہر ڈاکٹر (Hemotologist) کے مشورے اور ہدایت پر سختی سے عمل کر رہا ہوں۔'' سنبل نے مسکرا کر کہا

''اچھا! اسی لیے آپ مجھے بھی بار بار ہدایت دیتے رہتے ہیں کہ یہ کھاؤ یہ نہیں۔ ورزش کرو، متوازن غذا لو۔ آپ اتنا ٹوکتے تھے کہ مجھے غصہ آتا تھا۔ مگر اب بات سمجھ آئی۔'' راحیل نے سنبل کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف لڑکی! مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تمہیں کیا دقت ہے۔ اس لیے دھیان رکھ رہا تھا۔ کسی کو اس لیے نہیں بتایا کہ سب بے وجہ پریشان ہو جاتے۔ اب تمہیں بھی کچھ باتیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیں کہ ایک عام صحت مند فرد کو اگر چوٹ لگتی ہے تو قدرتی طور پر زخم پر خود بخود ایک جھلی سی بن جاتی ہے اور خون رک جاتا ہے۔ اس جھلی کو کلاٹ کہتے ہیں۔ جب جھلی بنانے والے فیکٹر کی جین متاثر ہو جاتی ہے تو فیکٹر بننے کا عمل رک جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خون جم نہیں پاتا۔ ارے ہاں! ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے جسم میں کل 46 کروموزوم ہوتے ہیں یعنی 23 جوڑے۔ کروموزوم کے ان جوڑوں میں ایک جوڑا ہماری جنس کا تعین کرتا ہے۔ اس جوڑے میں ایکس اور وائی کروموزوم (Chromosome) ہوتے ہیں۔ خواتین میں دو ایکس کروموزوم اور مردوں میں ایک ایکس اور ایک وائی کروموزم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایکس کروموزوم میں دقت کے بعد یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ماں اور باپ دونوں ہی ہیموفیلیا کے مریض ہوں گے تو بچوں کے بیماری سے متاثر ہونے کے فیصد میں اضافہ ہو جائے گا۔'' زبیدہ خالہ نے اپنے دونوں پوتے پوتی کو گلے لگایا اور کہا۔

''ایکس وائی اور یہ فیکٹر ویکٹر مجھے نہیں معلوم۔ میں خود ڈاکٹر سے بات کروں گی کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ سب جاننے کے بعد ہی اپنے بچوں کی شادی کے بارے میں سوچوں گی۔ میرے بچوں کو اللہ سلامت رکھے۔ راحیل نے سمجھداری دکھائی ورنہ میں تو بے کار ہی ضد پکڑے بیٹھی تھی۔'' زبیدہ کی بات سن کر میمونہ بی نے کہا

''میں نا کہتی تھی میرا راحیل بہت سمجھدار ہے۔'' راحیل نے اپنی بانہیں بی دادی کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا

''لیکن بی دادی سے تھوڑا کم!'' راحیل کی بات سن کر سبھی کھلکھلا کر ہنس دیے

Shahtaj Khan
588/2b, Plot No. 40
Flat No. 4, Hayat manzil
New Era society Bibwewadi, Marketyard
Pune-411037 (M.S)
Mob 9225545354

عظمیٰ یزدانی

اندھیرا

بارش کا موسم، بجلی کڑکنے پر دھڑکتا ہوا دل، سرد ہوائیں اور بتی کا گُل ہو جانا۔۔۔۔۔

آج پھر سکینہ کے گھر کی لائٹ گل ہوگئی۔ اتنی زور کی آندھی اور دن میں رات سا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ دکھائی دیتا ہو۔ اچانک دروازے پر کسی کی دستک ہوئی۔

سکینہ کی ماں جو کہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، بیٹی کو پکارنے لگی۔ "سکّو۔۔۔! اری او سکّو۔۔۔"!! "ذرا ادھر آ تو سہی، دروازے پر کون مُوا دستک دے رہا ہے۔۔۔"؟ شاید ہماری پڑوسن رانو ہو۔۔۔؟ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آنے کے باوجود بھی سکینہ بڑے ہی آرام سے دروازہ کھولنے گئی۔ اسے ایک شخص کی موجودگی کا احساس ہوا جو راستہ بھٹک چکا تھا۔

سکینہ نوجوان سے مخاطب ہوئی؛" کہیے۔" "میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں"۔۔۔؟

سکینہ کی آواز سن کر نوجوان تھوڑا بے چین ہوگیا۔ سکینہ کا چہرہ اندھیرے میں اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ٹٹولنے کی کوشش کرنے لگا۔ سکینہ کی آواز کی مٹھاس اس نوجوان کو اس کی طرف مائل کر رہی تھی۔

نوجوان کو ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ راستہ پوچھنے آیا تھا۔

سکینہ دوبارہ نوجوان سے مخاطب ہوئی۔" آپ کو کس سے ملنا ہے"؟ نوجوان اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آیا اور کہنے لگا۔" دراصل میں راستہ بھول گیا ہوں اور جس کاغذ پر پتہ لکھا ہوا تھا وہ بھی اس کم بخت بارش کی وجہ سے پوری طرح بھیگ چکا ہے"۔ سکینہ کو بڑا افسوس ہوا "اوہو۔۔! "اب کیا کیا جائے۔۔۔؟؟ کم بخت یہ بارش.....!" نوجوان سکینہ سے کہنے لگا، "کوئی بات نہیں، میں چلتا ہوں۔۔۔! ہوسکتا ہے جس سے میں ملنے آیا ہوں وہ مجھے راستے میں پہچان لے یا میں۔۔۔۔۔۔۔۔!

نوجوان نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ سکینہ کی ماں باہر آ گئی اور نوجوان کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔" ارے نہیں، نہیں بیٹا اتنی بارش میں کہاں جاؤ گے....! ذرا بارش رک جانے دو پھر چلے جانا۔"

زہرہ بی کے کافی اصرار کرنے پر نوجوان انکار نہیں کر سکا اور رُک گیا۔ زہرہ بی نے سکینہ کو چائے بنانے کے لئے کہا تو نوجوان انکار کرنے لگا

جس پر وہ بگڑ کر کہنے لگیں ،" کیوں بیٹا غیروں کے گھر کا پانی نہیں چلتا کیا۔۔۔؟؟ نوجوان کہتا ہے،" نہیں اماں۔۔۔! ایسی بات نہیں ہے"۔ زہرہ بی نے کہا ،"لو کر لو بات، اماں بھی کہتے ہو اور انکار بھی کرتے ہو۔۔۔!!! زہرہ بی نے سکینہ سے کہا" اری تو کیوں بت بنی کھڑی ہے، جا چائے ناشتے کا انتظام کر۔"

یُوں تو سکینہ بڑی گم صم اور شرمیلے مزاج کی لڑکی تھی۔مگر آج پتہ نہیں کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اِدھر سکینہ چائے بنانے میں مصروف تھی اور اُدھر زہرہ بی نوجوان سے گفتگو کر رہی تھیں۔

" بیٹا تمہارا نام نہیں بتاؤ گے۔۔۔؟ یا اس پر بھی انکار ہے..!"

نوجوان مسکرانے لگا،نہیں اماں۔نام بتانے میں انکار کیسا۔! مجھے سلمان کہتے ہیں۔"

زہرہ بی سلمان کو چھیڑتے ہوئے کہنے لگیں" وہ فلموں والا کیا۔۔۔؟" سلمان ہنس پڑا" نہیں اماں میرا نام شیخ سلمان ہے۔"

اچھا! اچھا! شادی وغیرہ ہوگئی۔۔؟" " نہیں ابھی نہیں۔" سکینہ چائے بنا کر لے آئی اور سلمان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔سلمان چراغ کی روشنی میں ہی سکینہ کو نہارنے لگا

" " اُف۔۔۔! یہ لہجے کی نرمی یوں آنکھوں کا بار بار جھک جانا، یوں شرم سے آنچل سنبھالنا۔کتنی میٹھی اور پیاری باتیں ہیں اس کی اور اس پر نظر کا نہ اٹھنا ، مانو حیا کا دامن تھام رکھا ہو، جتنی پیاری باتیں اتنی پیاری صورت روشنی کی کسے ضرورت۔!"

سکینہ کو بھی یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سلمان اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔اس پر بھی عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ تبھی بجلی آ گئی اور سلمان سکینہ کو روشنی میں دیکھ کر اور بھی دیوانہ ہوگیا۔وہ دل ہی دل میں یہ طے کر چکا تھا کہ شادی کروں گا تو اسی مہ جبین سے، ورنہ نہیں۔!"

بجلی پھر چلی گئی۔سکینہ ماچس لانے باورچی خانے کی طرف گئی اتنے سلمان نے زہرہ بی سے کہا

" اماں۔۔! میں تھوڑا ٹارچ دکھا دیتا ہوں سکینہ جی کو، وہ اتنے اندھیرے میں ماچس کیسے تلاش کریں گی۔۔؟

زہرہ بی نے افسردگی سے کہا، " رہنے دو بیٹا۔اسے عادت ہے۔" سلمان نے کہا" اندھیرا کافی ہے اماں۔"

زہرہ بی نے کہا

" ارے بیٹا۔۔! جس نے ہمیشہ اندھیرے میں ہی زندگی کا سفر طے کیا ہو اسے اس اندھیرے کی کیا پرواہ ہوگی!" سلمان تعجب سے کہنے لگا" میں سمجھا نہیں اماں جی۔۔! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔۔؟

زہرہ بی نے بھیگے لہجے میں کہا" اس بدنصیب کی قسمت میں اوپر والے نے اندھیرا ہی لکھا ہے، پیدائشی نابینا جو ٹھہری۔!"

سلمان کو مانو ایک زوردار جھٹکا سا لگا۔وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا اور قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔کچھ دیر بعد زہرہ بی سے کہا،" اچھا اماں جی۔۔! میں چلتا ہوں۔"

" اتنی بارش میں کیسے؟" سلمان نے بتایا" میرے والدین اسی گلی میں میرے لیے لڑکی دیکھنے آئے ہیں، وقت کافی ہو چکا ہے کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔!"

" اچھا بیٹا، گلی چھوٹی ہی ہے آسانی سے ڈھونڈ لو گے!"۔سلمان سلام کر کے انکے گھر سے چلا گیا۔تھوڑی ہی دیر بعد سکینہ بھی ماچس لے کر آ گئی اور سلمان سے مخاطب ہو کر کہنے لگی،

" یہاں روزانہ بارش کی وجہ سے بجلی چلی جاتی ہے لیکن آپ فکر نہ کریں میں ابھی روشنی کئے دیتی ہوں۔" زہرہ بی نے کہا

" ارے کس سے باتیں کر رہی ہے پگلی؟ وہ مسافر تو چلا گیا۔ " سکینہ حیرت زدہ ہو کر کہنے لگی ،" چلا گیا۔۔؟ لیکن۔۔۔ بارش تو رکی نہیں۔۔۔۔!

زہرہ بی نے کہا، اس کے والدین اس کے لئے لڑکی دیکھنے آئے ہوئے ہیں یہیں کسی مکان میں۔"

یہ سن کر سکینہ اپنے آنسو روک نہیں پائی اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان کی بجلی اسی پر گر پڑی ہو۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی لیکن وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کی پڑوسن رانو تھی جس کا انتظار اس کی اماں کر رہی تھی۔زہرہ بی نے کہا" جا تو رانو کے لئے چائے بنا لا۔" سکینہ خود کو سنبھالتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئی۔!

□□□

Uzma Yazdani
Gajri Bazar
Kamti
Distt. Nagpur-441002 (M.S)
8055904099/7620207776
uzmayazdani18@gmail.com

ڈاکٹر گلشن مسرت

سایہ

بھاگ کر اندھیروں سے
روشنی کی خواہش میں
جانے کیسے رستوں پر
پاؤں خود نکل آئے
تھے جہاں اندھیرے بس
روشنی کے در پردہ
تیرگی کے سائے تھے
پھر بھی ایک حیرت میں
نیل گوں اندھیرے میں
سانس کی بس آہٹ پر
پاؤں بڑھتے جاتے تھے
دور اس اندھیرے میں
ایک جھیل خوابوں کی
تشنہ روح تشنہ لب
بیکراں و بے پایاں
جو تھی میری
اس کے پاس میں جس دم
آ گئی تو کیا دیکھا
میری روح کی ٹھنڈک
جھیل میں نمایاں تھا
میری خواہشوں کا عکس
چاندنی میں گھل مل کر
ارضِ جاں پہ آ اترا
میں نے یک بیک یونہی
ہاتھ جو بڑھایا تو
صرف ایک سایہ تھا
چاندنی کے پیکر میں
خواب جھیل پانی میں
چاند بن کر آیا تھا
وہ تو صرف سایہ تھا

Dr.Gulshan Masarrat
347/161/16 Old Tikait Ganj
Lucknow- 226017 (U.P)
gulshan.masarrat9358gmail.com

غزلیں

ڈاکٹر عافیہ حمید

اس دل پہ سوا تیرے اثر کون کرے گا
الفاظ کو اب میرے گہر کون کرے گا

جب حسن تھا تو لاکھوں نے کی جان نچھاور
زلفوں کی سفیدی پہ نظر کون کرے گا

سب لوگ ہی شہروں کی چکاچوند میں گم ہیں
ویران حویلی میں گزر کون کرے گا

ہر شخص گھنا سایہ یہاں ڈھونڈ رہا ہے
تپتے ہوئے صحرا میں سفر کون کرے گا

اس دل کے نہاں خانے کی تصویر مٹا دی
ڈھلتے ہوئے سورج پہ نظر کون کرے گا

ہر رنگ میں جب حسن کے جلوے نظر آئیں
تو عشق کے دریا سے مفر کون کرے گا

تم نے بھی نہ کی عافی اگر فکر محبت
بجھتے ہوئے شعلوں کو شرر کون کرے گا

Dr. Aafiya Hameed
A/1429/3 Meena Market
Indira Nagar
Lucknow-226016 (U.P)
aafiyahameed917gmail.com

زیبا خان

زندگی کی تال پر ہی، رقص پا تھی زندگی
سوچتی ہوں میں ابھی تک، یار کیا تھی زندگی

درد و غم، وحشت، گھٹن، تنہائی اور آہ و بکا
کیا تمھیں لگتا ہے کچھ، اس کے سوا تھی زندگی

سانس کی ہر پل الجھتی ڈور کو تھامے ہوئے
اپنی دھن میں آپ ہی پیہم رواں تھی زندگی

گھر کی کھونٹی پر پڑی اک ملگجی پوشاک سی
جسم پر بوسیدہ زخموں کی ردا تھی زندگی

زیست سے اکتا گئی تو زیست ہی سے جا ملی
موت کا اک ناگہانی سلسلہ تھی زندگی

Zeba Khan
Research Scholar
Dept. of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
E-mail:kzeba1674gmail.com

ڈاکٹر اشرف آثاری

خواتین میں موٹاپا اور اس کے نقصانات

خواتین میں موٹاپے کا مرض اب پہلے سے بہت سرعت کے ساتھ پھیلنے اور بڑھنے لگا ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بعض خواتین مردوں کی بہ نسبت کم فعال و متحرک ہوتی ہیں جس کی وجہ سے مردوں کے مقابلے میں زیادہ موٹاپے میں مبتلا ہو کر طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں جن میں کچھ بیماریاں جان لیوا بھی ہو سکتی ہیں۔

ماہرین طب کا خیال ہے کہ خواتین میں موٹاپے سے کئی سنگین اور مہلک بیماریوں کا خطرہ بڑھ سکتا ہے جن میں سرفہرست ذیابیطسِ شکری، امراض قلب، چھاتی کا کینسر، پی سی او ڈی، حمل کے مسائل کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر بیماریاں بھی شامل ہیں، جن میں کچھ مہلک بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ موٹاپا انسانی صحت پر بڑے مضر اثرات مرتب کر سکتا ہے اور اوسط عمر کو بھی کم کر سکتا ہے۔ ذیابیطس شکری اور ہارٹ اٹیک جیسی جان لیوا بیماریوں کے لیے بھی موٹاپے کو ہی زیادہ ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ انفرادی، اجتماعی، قومی اور عالمی سطح پر بھی صحت کی دیکھ بھال کے ضمن میں ،موٹاپا عام ہونے سے مالی بوجھ بڑھ سکتا ہے۔ جس سے ممالک کی مجموعی ترقی بھی متاثر ہو سکتی ہے یا رک سکتی ہے۔

دنیا کے تقریباً تمام ممالک کو ہی اس مسئلے نے گھیر لیا ہے اور موٹاپے کی بیماری ہر جانب بڑھ رہی ہے اور یہ وبا ء سب کو اپنے لپیٹ میں لے رہی ہے۔ تقریباً 88% لوگ جسمانی عدم فعالیت اور غیر صحت بخش نامناسب اور غیر متوازن خوراک کی وجہ سے موٹاپے کا شکار ہیں اور ہو رہے ہیں ۔ایک حالیہ تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ماہرین طب کا کہنا ہے کہ بہت سے شہروں میں 2500 افراد کا معائنہ کرنے کے بعد 88% مرد و خواتین، یعنی دونوں ہی موٹاپے کے شکار پائے گئے۔ جبکہ 7% کا وزن زیادہ تھا اور صرف 5% لوگ ہی نارمل باڈی ماس انڈکس (BMI) والے تھے۔

ماہرین نے اس موقعے پر تمام لوگوں کو، خاص طور پر خواتین کو مشورہ دیا کہ انھیں اپنے روزمرہ استعمال ہونے والی خوراک کو بہتر بنانا چاہیے اور اپنی خوراک میں کاربوہائیڈریٹس اور چکنائی والے اجزا کے حصے کو کم اور محدود کرنا چاہیے اور ہر لحاظ سے فٹ اور تندرست و توانا رہنے کے لیے مناسب، بلکہ کم مقدار میں کھانا چاہیے اور چلنے پھرنے کی عادت بھی ڈالنی چاہیے۔ ماہرین نے خواتین کو مشورہ دیا کہ انھیں فاسٹ فوڈ استعمال نہیں کرنا چاہیے جو دراصل جنک فوڈ ہے۔

شوگر والے مشروبات کے استعمال سے گریز لازمی ہے اور اس کے بجائے گھر میں تیار کردہ صحت بخش کھانے اور مشروبات کا استعمال کرنا چاہیے جن میں چینی اور چکنائی کم ہو اور اس صاف ستھری اور سادہ خوراک کے مناسب مقدار میں استعمال کے بعد پیدل چلنے کی بھی عادت ڈالنی چاہیے اور ورزش کو بھی اپنا معمول بنانا چاہیے۔ تاکہ خوراک سے ملنے والی کیلوریز جسم میں جمع نہ ہونے پائیں اور ان کا صحیح مصرف بھی ہو۔

معروف ماہرین قلب کا کہنا ہے کہ شکر والی خوردنی اشیاء اور مشروبات سے، زیادہ چینی کے استعمال سے، وزن میں اضافہ تو ہوتا ہی

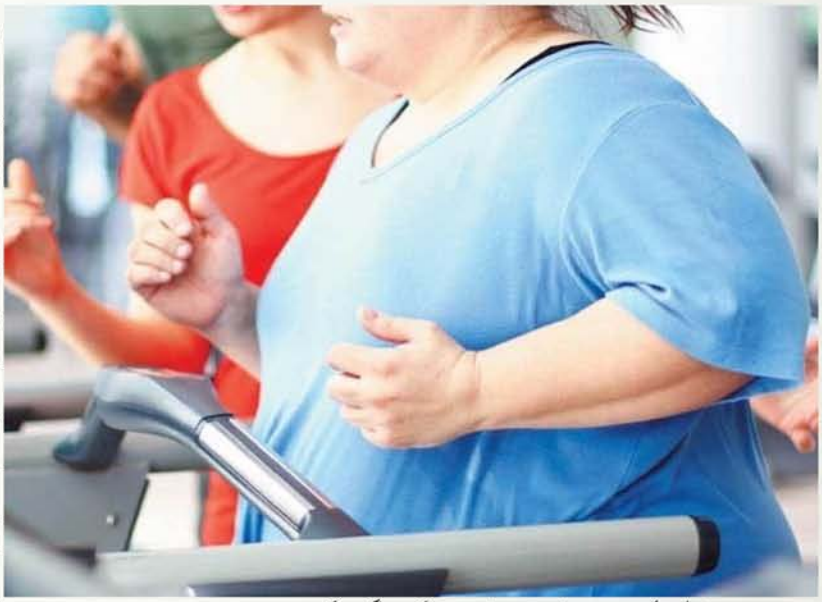

ہے ان سے ذیابیطس شکری ٹائپ ٹو اور امراض قلب، کینسر، جگر اور گردوں کی بیماریوں کا خطرہ بھی بڑھ سکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عالمی ادارہ صحت کے مطابق چینی کی مقدار کو کل کیلوریز کے 10% سے کم اور اضافی صحت کے فوائد کے لیے 5% سے کم تک محدود رکھنا چاہیے۔

میٹھے مشروبات میں چینی یا شکر کی زیادہ مقدار کے بارے میں عام لوگوں کا شعور بیدار کرنا اور انھیں موٹاپے سے پیدا شدہ بیماریوں کے بارے میں اور انسانی صحت کو ان کے خطرات سے واقف کرانا اور اس بحث کو سائنسی اور ماہرین طب کے نقطہ نگاہ سے وضاحت کرنا ضروری ہے۔

وجوہات و اسباب:۔ یہ بات اہم اور قابلِ غور ہے کہ موٹاپا صرف غذائی بداعتدالی اور وافر مقدار میں کیلوریز کے استعمال سے ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے اور اس سے جسمانی اثرات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی جاتی ہے فاسٹ فوڈ اور ڈبہ بند خوردنی اشیاء استعمال کرنے کا عمل روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے۔ ان میں سے اکثر اشیاء کو زیادہ سے زیادہ مزے دار اور ٹیسٹی بنانے کے لیے اور ان کی سیل بڑھانے کے لیے، انیمل فیٹ کا استعمال کیا جاتا ہے جو وزن بڑھانے کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اہم وجوہات و اسباب بتائے جاتے ہیں جن کا مختصر تذکرہ ہی یہاں ممکن ہے، مثلاً

کثرت خور و نوش:۔ کچھ لوگ فارسی زبان کے اس مقولے ''زیستن برائے خوردن'' پر عمل پیرا دکھائی دیتے ہیں کہ وہ زندہ اس لیے ہوتے ہیں کہ صرف کھائیں اور پئیں، اس لیے نہیں کہ ''خوردن برائے زیستن'' کہ زندہ رہنے کے لیے کھائیں۔ یہاں یہ اہم بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ضرورت سے زیادہ کھانا پینا موٹاپے کے اولین وجوہات میں سے ہے ہر شخص اپنے لیے ڈائٹ چارٹ مرتب دیتے وقت اپنی جسمانی ضرورتوں، اپنے پیشے، محنت ومشقت وغیرہ کو مدنظر رکھ کر ہی فیصلہ لیتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ کیلوریز لینے سے خاص طور پر پیچیدہ کاربائیڈریٹس والی خوراک میں چربی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے ظاہر بات ہے کہ جو چربی ایک انسانی جسم کو بذریعہ خوراک میسر ہوتی ہے اگر وہ خرچ نہ ہو اور جلتی نہ رہے اور اس کا مصرف نہ ہو تو وہ جسم میں جمع ہونی شروع ہو جاتی ہے اور مسلسل جمع ہوتی ہی رہتی ہے اور یہی اضافی چربی موٹاپے کا سبب بن جاتی ہے۔

طرز زندگی:۔ جسمانی محنت ومشقت اور دیگر سرگرمیوں کے فقدان اور تساہل پسندی سے متحرک اور فعال نہ رہنے کی وجہ سے بھی جسم کو حاصل شدہ توانائی مناسبت اور اعتدال کے ساتھ خرچ نہ ہونے پر موٹاپا آسکتا ہے۔

جینیاتی اور وراثتی وجہ:۔ اگر موٹاپا وراثت میں ہو تو پھر دیگر ضروری اور لازمی عوامل اور وجوہات کی غیر موجودگی کے باوجود بھی اس کے سر اٹھانے کا امکان موجود رہ سکتا ہے۔ اور جلدی جلدی وزن بڑھانے کا باعث بن سکتا ہے دراصل اس کے ساتھ ہی اس سے متعلق دیگر امکانات جیسے بھوک کی زیادتی اور کچھ موروثی بیماریوں کی موجودگی کا امکان بھی بنا رہتا ہے جو موٹاپے کے لیے سیٹ فراہم کرتی ہیں مثلاً ذیابیطس وغیرہ۔

حاملہ خواتین:۔ اکثر حاملہ خواتین دورانِ حمل یا بچے کی پیدائش کے بعد، موٹاپے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسا دراصل شکم مادر میں بچے کی نشوونما سے متعلق خوراک کی بڑھتی ہوئی طلب کی وجہ سے ہوتا ہے۔

نیند میں خلل:۔ نیند میں خلل یا بے خوابی، ہاضمے سے متعلق ایک ہارمون کو متحرک و فعال بنا سکتی ہے جس سے زیادہ کیلوریز والی غذائیں کھانے کی خواہش وطلب میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ جو موٹاپے پر منتج ہو سکتا ہے۔

تھائیرائیڈ:۔ Cushing's Syndrome Hypothyroidism اگر اس طرح کا کوئی معاملہ ہو تو یہ بھی موٹاپے

کا سبب بن سکتا ہے۔

ہارمونل تبدیلیاں:۔ جسم میں موجود کچھ ہارمونز کی سطح میں کسی قسم کے اتار چڑھاؤ سے بھی موٹاپا ہوسکتا ہے۔اس لیے ان پر نظر رکھنی پڑتی ہے تا کہ بروقت علاج واحتیاط سے کام لیا جاسکے۔

نفسیاتی عوامل:۔ جذباتی ہیجان، تنہائی، ڈیپریشن، خود اعتمادی کی کمی، ذہنی پریشانی اور مالی مشکلات وغیرہ بھی بھوک اور وزن پر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور کسی بھی نفسیاتی خلل کا جسم کی صحت پر اثر لازمی ہے۔

موٹاپے کے خطرات پر ایک نظر:۔ خاندانی تاریخ، عادات واطوار جیسے، کثرت خوری کا خاندانی اور وراثتی رجحان، جو عام طور پر مشترکہ خاندانوں میں دیکھا جاتا ہے کہ افرادِ خانہ کثرتِ خوردونوش کی طرف زیادہ متوجہ و مائل ہوجاتے ہیں، کھانے پینے میں اعتدال اور کنٹرول نہیں رکھتے اور عام طور پر آزادانہ طور پر کھاتے پیتے رہتے ہیں۔خواہ وہ کسی کا ساتھ دینے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

عمر:۔ عمر کے ساتھ ساتھ موٹاپے کا خطرہ بھی بڑھ سکتا ہے غیر متحرک اور سست ہونا، فاسد خوراک کا استعمال، جسمانی بگاڑ اور ادویات کا مسلسل اور متواتر استعمال وغیرہ بھی موٹاپے کا کارن ہوسکتے ہیں۔

تمباکو نوشی:۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ تمباکو نوشی کے عادی افراد، تمباکو نوشی نہ کرنے والے افراد سے زیادہ موٹاپے کا شکار ہوسکتے ہیں۔

تشخیص:۔ موٹاپے کا تصور مختلف لوگوں میں مختلف ہوسکتا ہے ایک ماہر ڈاکٹر ہی خاندانی پس منظر، خوراک، پیشے سے متعلق سوالات اور دیگر ٹیسٹوں سے اس کا صحیح تعین کرسکتا ہے جیسے خون کی جانچ CBC تھائیرائیڈ ٹیسٹ TSH جگر کی کارکردگی LFT اور ذیابیطس اسکریننگ وغیرہ اور دیگر کوائف سے ہی کسی کے موٹاپے کی صحیح تشخیص ہوسکتی ہے۔

غذائی اعتدال:۔ مناسب مقدار میں متوازن خوراک کا استعمال، میٹھے اور نشاستہ دار اشیا کے زیادہ استعمال سے گریز، چربی والی اشیاء خوردنی کے ضرورت سے زیادہ استعمال سے پرہیز، جسمانی محنت اور روزانہ ورزش کرنے کی عادت ڈالنا جیسے اقدامات سے موٹاپے سے بچا جاسکتا ہے دیگر عوامل جو اس ضمن میں ضروری ہے۔سست روی و آرام طلبی، ڈبہ بند اشیاء اور جنک فوڈ کا زیادہ استعمال کھانے کے اوقات کی پابندی نہ کرنا، فطری نیند میں کسی قسم کا خلل، ذیابیطس اور تھائیرائیڈ کی بیماریوں کی موجودگی اور ان ادویات کا استعمال جو موٹاپا پھیلانے کا کارن بن سکتے ہیں، پرہیز بہت ضروری ہے۔

□□□

Dr. Ashraf Asari
Sudrabal
Hazratbal
Srinagar-190006 (Kashmir)
Cell:-941901724
E.mail: dr.ashraf.asari@gmail.com

مراسلہ

''خواتین دنیا'' کا تازہ شمارہ جون 2024 پیش نظر ہے۔ اس میں فنکاری کیا ہے کہ اس جریدہ کی طرح اس میں وہی تازگی وہی تمکنت اور دلکشی بھی ایسی جیسے چکنے چکنے پات پرنرم و نازک ترین کشادہ ہتھیلیوں سے آب حیات کے ٹپکتے قطرے اور رِستا ہوا پانی نوخیز پودوں کو تراوٹ بخشتا ہوا اور اب ورق کے اوپری سرے پر ملاحظہ فرمائیں۔ گویا یہی ادنیٰ سی کاوش دنیاوی کرۂ ارض کو سہارے سنبھالے ہوئے ہے۔ آپ ہر بار اپنے ہر شمارہ میں یہی انوکھی فنکاری پیش کرتے ہیں کہ نظریں مبہوت ہوکر پیکر تہنیت بن جائیں۔

اداریہ میں ماحولیات کے لیے درکار جن امور کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر ورق میں تمام تر عیاں ہیں۔ اداریہ میں یہ بھی احساس دلایا گیا ہے کہ اچھی صحت کے لیے کون سی تدابیر اختیار کرنی چاہیے جن کا بیشتر ماحولیات سے تعلق ہے کہ ہم اپنے ماحول کو کیونکر صاف ستھرا رکھیں۔ یہ ایک عمدہ سبق ہے۔

اداریہ کے بعد اس شمارہ میں 6، اصناف ادب شامل ہیں اور ان کے ذیل میں کوئی 16 ذیلی سرخیاں پیش کی گئی ہیں اس پر جمال شمارہ کے حسن ادب میں اضافہ کا باعث ہیں 10 بے مثل ادبائیں، شاعرات اور پانچ ادبائے شخصیت کے ذیل میں محمد نور احمد نور ''زینت ساجدہ، بحیثیت انشائیہ نگار'' پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زینت ساجدہ کا پہلا انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' 1945 میں شائع ہوا اور ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''اسلوب بیاں اور'' کے نام سے شائع ہوا۔ پھر مصنف نے انشائیہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انشائیہ دراصل مختصر تخلیق ہوتی ہے پھر اس ضمن میں ادیبوں کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور یہیں کام کی بات کی شروعات ہوتی ہے جو اخیر تک پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر ''شاعرات کے منتخب اشعار'' میں کوئی آٹھ شاعرات کے اشعار درج ہیں جن میں سے سبھی میں کوئی نہ کوئی معقول بات کہی گئی ہے۔ ''جہان نسواں'' کے 9 مقالوں میں ''کرشن چندر'' مولانا ابوالکلام آزاد'' سے متعلق تو اکثر تحریریں نظر سے گزرتی ہیں دیکھئے شاید آپ کو ان میں کوئی نئی بات محسوس ہو۔ کرشن چندر کے افسانے ص 34 پر دیے گئے جدول پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ نگار عظیم کی افسانہ نگاری اور صادقہ نواب سحر کی ڈرامہ نگاری میں اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ترنم خان نے اس سلسلہ میں امن کے فروغ میں خواتین کا کردار پیش کیا ہے۔ اس میں قابل قدر بات یہ ہے کہ اول تو اس میں امن کی تعریف پیش کی گئی ہے پھر اس کی اہمیت امن میں خواتین کا کردار اور عالمی امن کے فروغ میں خواتین کا کردار پھر فرداً فرداً خواتین پر کارہائے نمایاں کا جائزہ گویا ہر منزل کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے یہ دن کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ عصمت رحمان دراصل

اقبال مجید کے ناولوں کی نمائندگی کی ہے اور اسے عنوان دیا ہے ''آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت کا حاشیاہی تجزیہ'' ظاہر ہیکہ آگ کے پاس بیٹھنا ہوتو حاشیاہی تحفظ کی آخری حد ہے۔ اور یہ بھی اقبال مجید کی آخری دی گئی تحریر ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اقبال مجید پر راست لکھنے کی بجائے بطور عنوان ان کی آخری تحریر کا عنوان اپنے ہی مضمون کو کیوں دیا گیا؟ لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ انھوں نے مختلف لغات سے اقتباسات کے ذریعہ حاشیہ کی عمدگی سے وضاحت کی۔ رقیہ مقصود صاحبہ نے اپنا مقالہ ''غزال ضیغم کے افسانوں میں تانیثی شعور (ایک ٹکڑا دھوپ کا)'' کے خصوصی حوالہ سے پیش کیا ہے لیکن ضیغم کے ہی افسانوں سے اقتباسات لے کر انھوں نے اپنے موضوع کی اچھی طرح وضاحت کی۔'' شگفتہ جہاں صاحبہ نے ''سرزمین بنگالہ کا ایک اہم تاریخی ناول'' ''تماشائے اہل کرم'' پیش کیا ہے۔ غالب کے سفر کلکتہ کے لحاظ سے یہ ادبی اور پرکشش تحریر ہے۔ حسن سخن میں فرحانہ نازنین صاحبہ کی دو غزلیں ہیں آپ ان پر ذرا نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ محترمہ نے اپنی پہلی غزل میں اپنا تخلص استعمال نہ کیا جبکہ دوسری غزل میں تخلص پر علامت رہ گئی ہے۔ دونوں غزلیں متاثر کن ہیں۔ زبیدہ شکیل صاحبہ نے ایک آزاد نظم یعنی ردیف و قافیہ اور 'نہ جانے کیا سے' آزاد نظم ''ماں'' کو مخاطب کرتے ہوئے پیش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے قاری کے جذبات کو مہمیز ہوگی اس لحاظ سے اچھی نظم ہے۔ ''افسانہ'' کے تحت تین افسانے دیے گئے ہیں پہلے افسانہ کا عنوان ہے۔ ''لوگ کیا کہیں گے''، جس کی تخلیق محترمہ سیدہ ایمن عبدالستار صاحبہ نے کسی بانجھ لڑکی کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اس کا احوال بڑی عمدگی سے سپرد قلم کیا ہے۔ لڑکیوں کے مسائل پر اچھا افسانہ ہے۔ دوسرا افسانہ انصاری شاہین عبدالحکیم صاحبہ کا تحریر کردہ جو نہایت معیاری اور عمدہ افسانہ ہے انھوں نے دو فرقوں کے ماحول کے درمیان جو تقابل کیا ہے وہ بس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے گویا افسانے کے تقاضے کو پورا کر دیا۔ آخری افسانہ محترمہ نیلوفر وفا کا تحریر کردہ ہے افسانہ تو واجبی سا لگتا ہے پر اس میں کرداروں کے جو نام مستعمل ہیں وہ بہت اچھے اور خوبصورت ہیں اس لحاظ سے نظر سطور میں اٹک سی جاتی ہیں۔ انھیں پڑھیے آپ کو بھی اچھے لگیں گے۔

صحت کے ذیل میں معدے کا درد دیا گیا ہے جسے ڈاکٹر ابوسعید خالد جاوید نے اپنی کتاب ''درد علامت اور علاج'' میں لکھا ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے شائع کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں معدے کے درد کے علامات اور علاج پر بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے یہ علاج کی خاطر مفید مضمون ہے۔ اس طرح یہ شمارہ جو جمالیات سے پُر ہے ذہن کو تازگی اور روح کو طمانیت بخشتا ہے نہایت قابل قدر ہے بقول شاعر:

ترے جمال سے روشن ہے کائنات مری
مری تلاش تری دلکشی رہے باقی
خدا کرے کہ یہ دیوانگی رہے باقی

مصطفی ندیم خان غوری، زرینہ منزل، بی۔۱۱۔ گرین وہیل روضہ باغ، اورنگ آباد 431001 (مہاراشٹر اسٹیٹ)

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چاروں میگزین ملک اور بیرون ملک اپنی خاص پہچان رکھتی ہیں۔ جس طرح سے 'خواتین دنیا' نے مختصر عرصہ میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ بلکہ اس ضرب المثل کی طرح ہے کہ 'آفتاب آمد دلیل آفتاب' یعنی وہ اپنی مثال خود ہے۔ کیونکہ اس میں فکر و نظر کے اعتبار سے صرف خواتین تخلیق کاروں کی تخلیقات اور ان کی نگارشات پر تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مضامین کی اشاعت ہوتی ہے۔ اردو زبان کے علم و ادب میں دیگر زبانوں کی طرح خواتین تخلیق کاروں کی نمائندگی بھی قابل رشک ہے۔ قومی کونسل اور اردو زبان نے خواتین کی حوصلہ افزائی کے لیے چند سال قبل جو قدم اٹھایا ہے وہ ایک مستحسن کارنامہ ہے۔ یوں بھی یہ میگزین اپنی اشاعت کے آغاز سے ہی علمی و ادبی حلقہ میں خاص پہچان بنائے ہوئے ہے۔

اس میگزین میں اپنے شروعاتی دور سے ہنوز خواتین کی نگارشات سے متعلق مختلف موضوعات پر انتہائی معلوماتی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اس مجلہ کا عملہ اپنی حسن کارگی اور موضوعاتی انتخاب میں قابل تعریف کام انجام دے رہا ہے۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نئی لکھنے والی خواتین، جہان نسواں کی علمی و ادبی دنیا میں بڑی تیزی سے اپنی شناخت بنا رہی ہیں۔ اس میگزین کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب اس کے قارئین بڑی شدت سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں انتظار کرتے ہیں۔ جب ہم جیسے طالب علم 'خواتین دنیا' کے کسی بھی شمارے کے مشمولہ مضامین اور تخلیقات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی نگارشات کا تنوعات قاری کی توجہ مبذول کر لیتا ہے جو کسی بھی کتاب و رسالہ کے لیے بڑی بات ہوتی ہے۔ میگزین کے مشمولہ بیشتر مضامین اور تخلیقات اپنے موضوعات کا خاطر خواہ احاطہ کرتے ہیں۔ جو اس رسالہ کی بڑی خوبی ہے۔ امید ہے یہ میگزین مستقبل میں خوب سے خوب تر کی جانب اپنا ارتقائی سفر طے کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر سرفراز جاوید، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

ترتیب وتدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

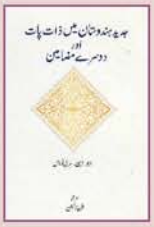

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

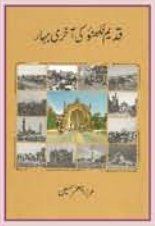

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

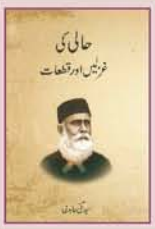

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जुलाई - २०२४ वर्ष: ८, अंक: ७
Mahnama Khawateen Duniya Monthly July 2024 ,Vol. 8, Issue: 7
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13- 07-2024
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159 ، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025